ماہنامہ
اکتوبر 2026ء

طلوعِ اسلام

لاہور
اشاعت کا بیاسی واں سال

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِی (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائد اعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

نظام کی پیدا کردہ بھوک کبھی صدقہ، خیرات، فری دستر خوان، این جی اوز اور ویلفیئر ٹرسٹ سے ختم نہیں کی جاسکتی۔ اس کا حل صرف قرآن کے نظامِ ربوبیت میں ہے۔

دوقومی قرآنی نظریہ

پر اسلامی مملکت کا قیام

مصنوعی ذہانت کی جانب سے جانچے گئے مسودۂ کتاب کو عالمی ریٹنگ میں 10 میں سے 9.7 اور 9.95 کا ممتاز درجہ دیا گیا ہے۔ انعام الحق صاحب کے فراہم کردہ جامع مفہوم کے مطابق، یہ مسودہ ''دو قومی قرآنی نظریہ'' اور ''اسلامی ریاست کے قیام'' پر ایک وقیع مطالعہ ہے۔ اس کی بڑی علمی خصوصیت یہ ہے کہ اسلامی ریاست کو محض سیاسی یا فقہی مسئلہ سمجھنے کے بجائے استدلال کا آغاز تصورِ خدا، انسان، اخلاقی ذمہ داری، علم، وحی، عقل، معیشت اور حکمرانی سے کرتے ہوئے ایک مربوط فکری ڈھانچہ تشکیل دیا گیا ہے۔

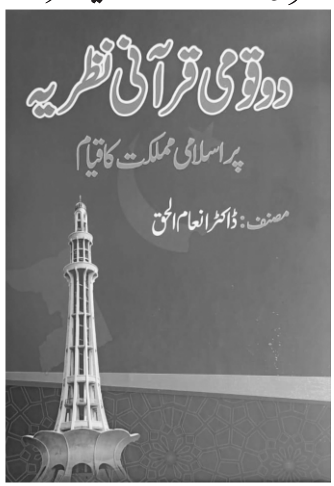

اس تحریر کی اصل قوت مرکزی فکری بہاؤ کا تسلسل ہے، جہاں قرآن کو بنیادی ماخذ بناتے ہوئے عقل، تحقیق اور اجتہاد کو پورا موقع دیا گیا ہے۔ یہ مطالعہ قرآنی مطالعات کو فلسفہ، نفسیات، معیشت اور سیاسی فکر سے ہم کلام کرتا ہے۔ اس کا مرکزی مقالہ یہ ہے کہ قومیت کی بنیاد نسل، زبان یا علاقے کے بجائے مشترکہ نظریہ اور طرزِ زندگی پر ہے، جبکہ قیامِ پاکستان کو ایک سیاسی مرحلہ اور قرآنی نظام کو ایک جاری معاشرتی عمل بتایا گیا ہے۔

مسودہ اسلامی ریاست کا معیار عدل، حکمرانی، مشاورت اور معاشی انصاف کو قرار دیتا ہے۔ اس میں دائمی الٰہی اصولوں اور انسانی اجتہاد کے درمیان واضح تفریق رکھتے ہوئے غیر ضروری تکرار سے گریز کیا گیا ہے۔ ماخذ کی تصدیق اور پروف ریڈنگ کے بعد اسے اشاعت کے لیے موزوں قرار دیا گیا ہے۔

نوٹ: اب یہ مسودہ کتابی شکل میں آ چکا ہے۔ قیمت: 500 روپے ہے۔ یہ کتاب ادارہ طلوعِ اسلام سے آرڈر پر منگوائی جا سکتی ہے۔ رابطہ نمبر وٹس ایپ: 0318-2221851 --- 0310-4800818

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
اکتوبر 2026ء

جلد 79 | شمارہ نمبر 10

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 100 روپے فی پرچہ
پاکستان: 1200 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1500 روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: جب تک اقتدار قانون کا نہ ہو	ادارہ	4
مشینی انسان اور قرآنی نظام	پرویز علیہ الرحمہ	6
نمائندہ چٹان کا پرویز صاحب سے انٹرویو	ادارہ	18
وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ (10:57)	آصف جلیل، لاہور	36
تشکیلِ معاشرہ اور قرآنی کردار	ڈاکٹر علی نصیر عباسی	42
کیا شوہر اپنی بیوی کو بدنی سزا دے سکتا ہے؟	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	54
چوتھائی صدی کا قصہ ہے	شیخ عقیل حیدر، فیصل آباد	61

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
Cell: +92 318 2221851
idarati@gmail.com
www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور — اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

جب تک اقتدار قانون کا نہ ہو

انسانوں کے مفاد ہمیشہ آپس میں ٹکراتے چلے آ رہے ہیں اور اس ٹکراؤ سے باہمی کشمکش اور تنازعات کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ حکومت کے قیام کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایسے تنازعات و تزاحمات کو حسن وخوبی اور عدل و انصاف سے نپٹایا جائے لیکن عام طور پر دیکھا یہی گیا ہے کہ حکمرانی کی لذت اور اقتدار کا چسکا حکمرانوں کو ایک دوسری راہ پر ڈال دیتا ہے۔ جہاں عدل و انصاف اور فہم وبصیرت کی بجائے اپنی ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو کر، وہ حرص اور خودغرضی کا سہارا لیتے ہیں اور ہر قسم کی جواب دہی سے روگردانی اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی مطلق العنانی کا دوسرا نام استبداد ہے۔ فرعون اسی استبداد کا مجسمہ تھا۔ دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کا استبداد ہے جس کی گرفت انسانی ذہن پر ہوتی ہے اور ہامان اسی استبداد کا مجسمہ تھا اور پھر سرمایہ داری کا استبداد ہے جو انسان کی اخلاقی جرأتوں کو پامال کرتا ہے۔ قارون اسی استبداد کا مجسمہ تھا۔ قرآن کریم میں داستان بنی اسرائیل میں فرعون، ہامان اور قارون کا ذکر دراصل تاریخ انسانی کے استبداد کی داستان ہے اور تاریخ انسانی میں جہاں جہاں استبداد نظر آئے گا وہ اس زمانے کے فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں کی وجہ سے ہوگا اور ان کے باہمی گٹھ جوڑ سے ہوگا۔

استبداد میں حکومت یا تو کسی قانون یا رائے عامہ کی پابند نہیں ہوتی یا ایک حد تک پابند تو ہوتی ہے مگر اختیار رکھتی ہے کہ جب چاہے اس پابندی کو دور کر دے۔ جس طرح مطلق العنان بادشاہوں کی حکومتیں مستبد ہوتی ہیں اسی طرح ان بادشاہوں کی حکومتیں بھی مستبد ہو سکتی ہیں جن کے ہاں مجلسِ مشاورت تو موجود ہو مگر وہ خود جواب دہی سے آزاد ہوں۔ اسی طرح وہ حکومتیں بھی مستبد ہو سکتی ہیں جو نمائندہ یا غیر نمائندہ جماعتوں کے ہاتھ میں ہوتی ہیں کیونکہ مشاورت میں چند افراد کی شمولیت استبداد کا سدباب نہیں کر سکتی بلکہ بعض اوقات اس قسم کی حکومتیں شخصی حکومتوں سے بھی زیدہ جابر اور مضر ہوتی ہیں۔ پاکستان کی سابقہ تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ نیز وہ حکومتیں بھی مستبد ہو سکتی ہیں جو عوام کی نمائندہ تو ہوں لیکن ان میں تنفیذی قوتیں قانونی قوتوں کے سامنے جواب دہ نہ ہوں اور جس میں عوام، حکمرانوں کا محاسبہ کرنے کا حق نہ رکھتے

ہوں۔ غرضیکہ کوئی حکومت استبداد سے مبرا نہیں ہوسکتی۔ جب تک اقتدار قانون کا نہ ہو اور وہ قانون بھی خالصتہً انسانی ذہن کی پیداوار نہ ہو۔

استبداد کو مٹا کر اس کی جگہ عدل لانے کے لئے پہلے زندگی کی اقدار کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ یہی کلیدی نقطہ ہے۔ جیسی اقدار ویسی زندگی۔ اقدار کے بدلنے سے زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے۔ نگاہ کا زاویہ بدلنے سے داخلی انقلاب آتا ہے اور داخلی انقلاب کے بعد خارجی انقلاب کا آنا لازمی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس انقلاب کو (By Revolution) لائے تھے لیکن فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں نے پھر نگاہ کے زاویے بدل دیئے قرآن کی دی ہوئی روشنی چھپ نہیں سکتی اور اب وہ (By Evolution) اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی نمودار ہوتی چلی جا رہی ہے۔ انسانیت اپنے ماحول سے مجبور ہو کر ان مستقل اقدار کی طرف بڑھ رہی ہے جو قرآن نے دی ہیں۔ انسانیت کا زاویہ نگاہ بہر صورت بدل کے رہے گا لیکن اگر کوئی موجودہ قوم یا حکمران یا چیف جسٹس ہی کائناتی قوتوں کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو جائے تو وہ انقلاب آج آ سکتا ہے جو دس بیس یا سو سال کے بعد آنے والا ہے۔ آج بھی اگر کوئی مردِ مومن میدان میں آ جائے تو اس کی ایک نگاہ سے تقدیریں بدل سکتی ہیں لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ''حکم'' اللہ کے قانون کا ہو جن کے ہاتھ میں اس قانون کا نفاذ ہو وہ اپنی بشریت کے تقاضوں کو قانون کے تقاضوں سے الگ رکھیں اور اپنا معیار زندگی ایک عام انسان کے معیار زندگی کی سطح پر لے آئیں۔ اس صورت میں پھر وہی عدل و مساوات کا دور واپس آ سکتا ہے جو صدر اول میں تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ بات انتہائی افسوسناک ہے کہ گزشتہ مالی سال میں پاکستان نے تعلیم اور صحت کی مد میں مختص کی گئی رقوم میں تاریخی کمی کی ہے اور 30 جون 2009ء کو ختم ہونے والے مالی سال میں یہ 1.1 اور 0.3 فیصد رہیں۔ وطن عزیز میں پچھلی کئی دہائیوں سے تعلیم اور صحت کی مد میں اتنے کم تناسب سے رقوم خرچ نہیں کی گئی تھیں 1990ء کی دہائی کو فوجی ڈکٹیٹر پرویز مشرف کے دور میں اسٹیٹ بینک نے بھی معیشت کے لحاظ سے ناکام دہائی قرار دی تھی مگر اس دہائی میں بھی تعلیم کی مد میں 2.3 فیصد اور صحت کی مد میں 0.7 فیصد رقوم خرچ کی گئی تھیں یہ امر یقیناً اس لئے بھی مزید تشویشناک ہے کہ مالی سال 2009ء میں مجموعی ملکی پیداوار کے تناسب سے تعلیم اور صحت کی مد میں پاکستان میں خرچ کی جانے والی یہ رقوم افریقہ کے بہت سے انتہائی غریب ملکوں کے مقابلے میں بھی انتہائی کم ہیں بلکہ حکومت کے شاہانہ اخراجات اور حکمرانوں کے سرکاری خرچ پر ٹھاٹھ باٹھ ان مالدار صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کے حکمرانوں کے سرکاری اخراجات سے کہیں زیادہ ہیں جن سے ہم امداد اور قرضوں کے طلبگار رہتے ہیں۔ وطن عزیز کی معیشت رو بہ زوال ہے اور ملک میں غربت، بے روزگاری تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ یہ امر نہایت افسوس ناک ہے۔

پرویزؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مشینی انسان اور قرآنی نظام

یہ واقعہ ہے مملکتِ خداداد پاکستان کے دارالسلطنت' اسلام آباد کا' جسے احمد بشیر صاحب نے ڈوبتے ہوئے دل' کانپتے ہوئے ہاتھوں اور بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ لکھا اور روزنامہ دی مسلم کی اشاعت بابت 24 اپریل 1981ء میں شائع ہوا اس کارواں ترجمہ ملخصاً درج ذیل کیا جاتا ہے' متعلقہ نام احتیاطاً حذف کرتے ہوئے۔

وہ ایک ممتاز خاندان کی نہایت ہونہار بچی تھی۔ آرٹ کی طالبہ، والدہ اہلِ قلم، والد ادیب بھی اور شاعر بھی اور اس کے ساتھ حکومتِ پاکستان کی طرف سے، ہندوستان میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز۔ بچی نے تین دن بعد، اپنی بیسویں سالگرہ منانے کے لئے اپنے ابو کے پاس جانا تھا کہ اسے بخار آیا، اور 8 اپریل کی شام حالت اچانک بگڑ گئی اور اس حد تک کہ معالج نے، جو خود ایک ماہر ڈاکٹر تھے، فیصلہ کیا کہ اسے فوراً آکسیجن ملنی چاہئے۔ اسلام آباد کے پالی ٹیکنیک ہسپتال میں لیبارٹری نہیں۔ اس کے لئے نیشنل ہیلتھ لیبارٹری کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ وہ لیبارٹری دو بجے بند ہو جاتی ہے اور اس وقت ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ مریضہ کی والدہ کار میں بیٹھیں۔ بچی کو اپنی گود میں لٹایا اور اس کے چھوٹے بھائی' اور ڈاکٹر کے ہمراہ' تیزی سے۔۔۔' ہسپتال' راولپنڈی کی طرف روانہ ہو گئے۔ وقت کا ایک ایک لمحہ مریضہ کی کش مکش موت وحیات میں اضافہ کئے جا رہا تھا' اس بیم ورجا کے عالم میں یہ مسافت خدا خدا کر کے طے ہوئی۔ چھ بج کر دس منٹ پر ان کی کار، (M.I. ROOM) کے سامنے کھڑی تھی۔ حالات کی نزاکت کا تقاضا تھا کہ مریضہ کو ایک ثانیہ کی تاخیر کے بغیر آکسیجن مل جائے۔ لیکن اور یہی ''لیکن'' ہے جس کے لئے ہم نے اس جانگداز واقعہ کو اپنے ہاں پیش کرنے کی ضرورت سمجھی ہے وہ لیکن یہ ہے کہ ہسپتال کے اس وقت کے انچارج نے کہا کہ مریضہ چونکہ (Civilian) ہے اس لئے اسے ویسے ہی داخل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے پہلے فلاں فلاں فارم پُر کرنے ہوں گے۔ اتنی رقم پیشگی جمع کرانی ہو گی۔ اس کے بعد متعلقہ اتھارٹی کی اجازت سے مریضہ کو داخل کیا جا سکے گا۔

> اس نظامِ حکومت کو بیوروکریسی کہا جاتا ہے۔ یعنی ''میزوں کی حکومت'' (اس لفظ کے بنیادی معنی یہی ہیں)۔ فائلوں کی حکومت۔ کاغذوں کی حکومت۔ اس نظامِ حکومت میں سب سے زیادہ قابل' دیانتدار' ذمہ دار' معتمد علیہ افسر' اسے سمجھا جاتا ہے جو متعلقہ افراد کو انسان سمجھے بغیر' ان کے معاملات کا متعلقہ قواعد وضوابط کے مطابق فیصلہ کر دے۔

مریضہ زندگی کے آخری سانس گن رہی تھی۔ حرماں نصیب ماں، اسے اپنی گود میں لئے حسرت بھری نگاہوں سے اس کی ڈوبتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر مایوسی کے آخری لمحات میں اس کی نبض ٹٹول رہا تھا۔ اس کا بھائی (Formalities) کی تکمیل کے لئے اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا۔ چھ بج کر پچاس منٹ پر خدا خدا کر کے یہ مراحل طے ہوئے تو انچارج صاحب نے ملازموں سے کہا کہ مریضہ کو اندر لے آؤ۔ وہ کار کے قریب پہنچے لیکن مریضہ لرزتے ہوئے ہونٹوں سے اپنی ماں کو الوداعی سلام کر کے پہلے ہی جا چکی تھی۔

ہسپتال کی انتظامیہ مطمئن تھی کہ انہوں نے قواعد وضوابط کی خلاف ورزی نہیں ہونے دی۔

❁❁❁❁❁

اور یہ بھی اسی اسلام آباد کا واقعہ ہے۔ وقاص شاہین، ایک چھوٹا سا بچہ خون کے سرطان کے مہلک مرض کا شکار ہے جس کا پاکستان میں علاج نہیں ہوسکتا۔ غریب باپ کی فریاد کسی نہ کسی طرح صدرِ مملکت کے کانوں تک پہنچ گئ اور انہوں نے وزیرِ صحت کے مشورہ کے بعد، از راہِ شفقت اور ہمدردی، حکم صادر فرمایا کہ بچے کو سرکاری اخراجات پر علاج کے لئے باہر بھیج دیا جائے۔ اس پر اس مریض کے نام کا فائل کھل گیا۔ یہ فائل، ایوانِ حکومت کی غلام گردشوں میں چکر لگا رہا ہے۔۔۔ کبھی ایک منسٹری میں، کبھی دوسری میں۔ فائل چکر پر چکر کاٹ رہا ہے اور بچے کی حالت نازک سے نازک تر ہوتی جا رہی ہے۔ غریب باپ ایک ایک کی منتیں کر رہا ہے۔

یہ خبر روزنامہ دی مسلم کی 6 مئی 1981ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ معلوم نہیں اس کے بعد اس فائل اور اس بچے پر کیا بیتی؟ [1]

❁❁❁❁❁

ہم نے نہ تو پہلا واقعہ اس لئے درج کیا ہے کہ متعلقہ ہسپتال کے ذمہ دار اربابِ انتظامیہ کے رویہ کے خلاف کوئی شکایت کی جائے اور نہ ہی دوسرا واقعہ۔ اس لئے کہ متعلقہ محکموں کے جہانِ سنگ وخشت میں انسانی قلب کی تلاش کی جائے۔ ہم نے ان واقعات کو (جو اسی قسم کے سینکڑوں واقعات کی مثالیں ہیں) کسی اور مقصد کے لئے درخورِ اعتنا سمجھا ہے۔

بیوروکریسی:

ان واقعات کے ذمہ دار نہ تو متعلقہ ہسپتال کے اربابِ بست وکشاد ہیں اور نہ ہی ان محکموں کے احبابِ حل وعقد۔ اس کا ذمہ دار ہے وہ نظامِ حکومت جسے بیوروکریسی کے (Bureaucracy) کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ اور اس کا (غلط العوام ترجمہ) ''نوکرشاہی'' آپ نے سینکڑوں بار پڑھا اور سنا ہوگا لیکن اس کے مفہوم یا مطلوب پر کم غور کیا ہوگا۔

[1] 28 مئی 1981ء کے ''دی مسلم'' میں یہ خبر چھپی ہے کہ اس بچے کی حالت بے حد نازک ہوچکی ہے اور فائل ابھی تک، سپوٹنک کی طرح، دفاتر کی لامتناہی فضاؤں میں گھوم رہی ہے۔ صدرِ مملکت نے کہا تھا کہ بچے کے باپ کو، جو سرکاری ملازم ہے، کسی ایسے ملک میں تعینات کر دیا جائے جہاں اس کے بچے کا علاج ہو سکے۔ یہ ڈیڑھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ سوچئے کہ جس نظام میں صدرِ مملکت کے حکم کی تعمیل اس طرح ہوتی ہو، وہاں عام معاملات کا حشر کیا ہوتا ہوگا؟

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کوئی نئی مشین باہر سے آتی ہے تو اس کے ساتھ ایک پمفلٹ ہوتا ہے جس میں اس مشین کے کل پرزوں کی تفصیل درج ہوتی ہے اور یہ بتایا گیا ہوتا ہے کہ مشین میں فلاں نقص پیدا ہوجائے تو کیا کرنا چاہئے۔ اس مشین کا اپریٹر اس مشین کو چلاتا رہتا ہے اور اگر اس میں کوئی نقص پیدا ہوجائے تو جھٹ سے پمفلٹ کھول کر متعلق ہدایات کا مطالعہ کرتا اور ان کے مطابق مشین کی اصلاح کردیتا ہے۔ اس سارے عمل میں ایک بات قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ ایسا کرتے وقت اس کا صرف دماغ کام کرتا ہے اس کے دل کا اس سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ دل کا واسطہ انسان سے ہوتا ہے مشینوں سے نہیں۔

مغرب کی مادہ پرستی (Materialism) سے جب تصورِ حیات میں تبدیلی آئی تو اس کی رُو سے انسانوں کو بھی مشینیں تصور کرلیا گیا۔ اسے کہتے ہیں (Mechanical Concept of Life)۔ اس سے انسانوں کے (Human Beings) ہونے کا تصور ختم ہوگیا۔ اور ان کے معاملات کا حل اسی طریق سے سوچا جانے لگا جس طریق سے کسی مشین کا نقص دُور کیا جاتا ہے۔ اس طریق کی رو سے انہوں نے حکومتی نظم ونسق کے لئے بھی قواعد وضوابط منضبط کئے اور ان کے پمفلٹ متعلقہ شعبوں میں بانٹ دیئے۔ منتظمہ کے کارپردازوں کو ان قواعد وضوابط کی تعلیم دی گئی اور انہیں سمجھا دیا گیا کہ جو مسئلہ (Case) ان کے سامنے آئے اس کے متعلق دیکھ لیا جائے کہ، اس پمفلٹ میں کیا لکھا ہے۔ اس کے مطابق اس معاملہ کا تصفیہ کردیا جائے اور ایسا کرنے میں کسی انسانی تقاضا کو دخل اندازنہ ہونے دیا جائے۔ ان انسانوں کو مشین سمجھا جائے اور اپنے آپ کو مشین کا آپریٹر۔ اس نظامِ حکومت کو بیوروکریسی کہا جاتا ہے۔ یعنی ''میزوں کی حکومت'' (اس لفظ کے بنیادی معنی یہی ہیں)۔ فائلوں کی حکومت۔ کاغذوں کی حکومت۔ اس نظامِ حکومت میں سب سے زیادہ قابل' دیانتدار' ذمہ دار' معتمد علیہ افسر' اسے سمجھا جاتا ہے جو متعلقہ افراد کو انسان سمجھے بغیر' ان کے معاملات کا متعلقہ قواعد وضوابط کے مطابق فیصلہ کردے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اسے بھی اس کا اطمینان ہوجاتا ہے کہ اس نے اپنے فرائض کو پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کردیا، اور افسران بالا بھی اس کی فرض شناسی کی تعریف کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو اس سے واسطہ نہیں ہوتا کہ اس سے انسانیت پر کیا بیتی؟ یہ گوشہ ان کی ذمہ داری کے احاطہ ہی میں نہیں ہوتا۔

> آج ہمارا معاشرہ جس اضطرابِ پیہم کی آماجگاہ بن رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں انسانی معاملات کا فیصلہ قواعد وضوابط کے مطابق' دیانتدارانہ طور پر کیا جاتا ہے، وہاں انسانی تقاضوں (Human Consideration) کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔۔۔ وہاں ترجیح ''فارمز کے پُر کرنے'' کو دی جاتی ہے، انسانی زندگی کو نہیں۔

جب اس ہسپتال کے ملازمین نے، قواعد وضوابط کی پابندی کے مطابق ہسپتال کا دروازہ نہیں کھولا تھا تو وہ پوری طرح مطمئن تھے کہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔ انہیں اس سے غرض نہیں تھی کہ اس سے اس مریضہ کا انجام کیا ہوا؟ حتیٰ کہ اگر مرحومہ کی موت کے متعلق کوئی انکوائری بھی ہو' اور یہ ثابت ہوجائے کہ انہوں نے جو کچھ کیا تھا قاعدے اور قانون کے مطابق کیا تھا، تو انہیں اس کے لئے موردالزام نہیں ٹھہرایا جائے گا۔ اس کے برعکس' اگر یہ معلوم ہوجائے کہ انہوں نے کسی قاعدے کی

خلاف ورزی کی تھی (خواہ وہ مریضہ کی جان بچانے کے لئے ہی کیوں نہ ہو) تو انہیں چارج شیٹ دیدیا جائے گا۔ بیوروکریسی کا یہی تقاضا ہے۔

بیوروکریٹ اس نظام کو اس لئے گلے سے لگائے رکھتے ہیں کہ اس میں انہیں نہ معاملات کے فیصلہ میں چنداں کاوش کرنی پڑتی ہے، نہ اس کے عواقب کی کوئی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ جب وہ متنازعہ امور کا فیصلہ متعلقہ قواعد وضوابط کی رُو سے (میکانکی طور پر) کردیتے ہیں تو اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوجاتے ہیں۔ یہ خلش انہیں ستاتی ہی نہیں کہ اس سے ''انسانیت'' پر کیا گزری ہے؟

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام　　کشتی کسی کی پار لگے، درمیاں رہے

آج ہمارا معاشرہ جس اضطرابِ پیہم کی آماجگاہ بن رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں انسانی معاملات کا فیصلہ قواعد وضوابط کے مطابق، دیانتدارانہ طور پر کیا جاتا ہے، وہاں انسانی تقاضوں (Human Consideration) کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔۔۔ وہاں ترجیح ''فارمز کے پُر کرنے'' کو دی جاتی ہے، انسانی زندگی کو نہیں۔ اور جہاں ان ضوابط میں لچک پیدا کی جاتی ہے تو اس کا جذبۂ محرکہ ذاتی مفادات (رشوت ستانی اور بدعنوانی) ہوتا ہے۔ نتیجہ دونوں کا کرب واضطراب اور عدمِ سکون واطمینان ہوتا ہے۔

❁❁❁❁❁

ان لوگوں کی یہ ذہنیت اور یہ اندازِ عمل، ان کی سرکاری زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا۔ رفتہ رفتہ یہ ان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتا ہے۔ معاشرتی زندگی کا کوئی گوشہ ہو، ان کے تعلقات اور روابط یکسر مشینی بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان میں انسانی حسیات کی رعایت یا جذبات کی لطافت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اُن کے گھر کی زندگی بھی ''بابوآنہ'' بن کر رہ جاتی ہے۔ آپ نے کھانے پینے کی بعض درآمدی چیزوں پر لکھا دیکھا ہوگا:

Un-Touched by Hand During Manufacture.

ان کے بنانے کے دوران ہاتھ کو نہیں چھونے دیا گیا۔

ان حضرات کی زندگی بھی کچھ ایسی ہی ہوجاتی ہے۔ یہ بالکل (Robots) مشینی انسان بن کر رہ جاتے ہیں [1]۔

جب خود اپنے بال بچوں کے ساتھ ان کا رویہ اس قسم کا مشینی ہو، تو دوسرے انسانوں کے ساتھ اُن کے برتاؤ میں لوچ کیسے آسکے گی۔ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

بملازمان سلطان خبرے دہم ز رازے　　کہ جہاں تواں گرفتن بہ نوائے دل گدازے

[1] ان میں مستثنیات بھی ہوتے ہیں جو اس جہانِ سنگ وخشت میں ذوقِ لطیف اور حسیاتِ انسانی کو برقرار رکھتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے میں انہیں کس قدر مشقت اٹھانی پڑتی ہے اس کا اندازہ باہر کا آدمی کم لگا سکتا ہے۔

’’نوائے دل گداز‘‘ سے یہ آشنا ہی نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ’’جہاں گیری‘‘ تو ایک طرف، جب یہ کرسی چھوڑ کر ریٹائرڈ ہوتے ہیں تو انہیں معاشرہ میں ایک بھی ہمنوا نہیں ملتا۔ یہ ’’یوسفِ بے کارواں‘‘ کی طرح اکیلے پھرتے رہتے ہیں۔

انہیں وقت گزارنے کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں ملتا۔ قفس کے خوگر پرندے کی طرح اُٹھتے ہیں تو دفتروں کا رُخ کر لیتے ہیں لیکن وہاں کی فضا ایسی بدلی ہوئی پاتے ہیں کہ پہلے برآمدے میں ان کے پاؤں کی آہٹ پا کر بابو لوگ کمرے کے اندر اپنی نشستوں سے اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اب کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کمروں کے اندر جاتے ہیں تو کوئی کرسی تک کی پیش کش نہیں کرتا۔ یونہی جھوٹی ہنسی کے ساتھ کبھی اس کے پاس کبھی اُس کے پاس کھڑے ہو کر واپس آجاتے ہیں۔ میر تقی نے غالباً انہی کے متعلق کہا تھا کہ

تیرے کوچے ہر بہانے یوں ہی دن سے رات کرنا　　کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

اس سے کہیں زیادہ عبرت انگیز اور قابلِ رحم اُن کی ایک اور حالت ہوتی ہے۔ ریٹائرڈ ہوتے ہیں تو ’’فتوحاتِ بالائی‘‘ کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور جو پنشن ملتی ہے، وہ تنخواہ کے نصف سے بھی کم ہوتی ہے، لیکن پنشن اُسی دن نہیں مل جاتی اُسے منظور کرانے کے لئے دنوں، مہینوں، سالوں تک دفتروں کے چکر لگانے پڑتے ہیں اور وہاں کے مشینی انسان ان کی حالتِ زار پر کبھی ترس نہیں کھاتے۔ بعض تو انہیں چکروں کے راستے عدم آباد تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ہر ایک سے شکایت ہی نہیں فریاد کرتے ہیں کہ پنشن سے متعلق دفاتر کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے انسان نہیں پتھر کے بُت ہیں جنہیں اس کا قطعاً خیال نہیں آتا کہ مجھ پر اور میرے بال بچوں پر کیا گزر رہی ہے۔

> قرآنی نظامِ عدل اور بیوروکریسی کے نظامِ عدل میں بنیادی فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ بیوروکریٹک نظام میں نہ مجرموں کو انسان سمجھا جاتا ہے، نہ جج کے سینے میں دھڑکنے والا دل ہوتا ہے۔ اس میں ضابطۂ قوانین کی حیثیت اور کیفیت اس پمفلٹ کی سی ہوتی ہے کہ جس میں مشین کی تفصیلات درج ہوتی ہیں۔ جج اس مشین کا اپریٹر ہوتا ہے، جو آنکھیں بند کر کے اس کی ہتھی گھما دیتا ہے۔ اس میں انسانی (Consideration) کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

ایسا کہتے وقت انہیں قطعاً یاد نہیں رہتا کہ کل تک وہ بھی اِنہیں کرسیوں پر پتھر بن کر بیٹھے رہتے تھے اور انہیں بھی کسی کے حالِ زار پر ترس نہیں آتا تھا۔ وہ ہر غرض مند کو یہ کہہ کر دھتکار دیتے تھے کہ میں قواعد و ضوابط کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

مذہب میں مشینی عمل:

مذہب کی دنیا میں پہنچ کر یہ رسوم پرستی اور ہی گل کھلاتی ہے۔ الدین زندگی کے حدود متعین کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے فرد کو فکر و عمل کی آزادی ہوتی ہے۔ اس کے لئے اسے اپنے لئے آپ فیصلہ کرنا اور اس فیصلے کی ذمہ داری قبول کرنا ہوتا ہے۔ اسے دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ فیصلہ ان مقاصد کی سمت ایک قدم ہے۔ جسے الدین نے متعین کیا ہے اور وہ مقصد ہے۔ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ ۔۔۔(13:17) ’’جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو‘‘۔ اس سے اس فرد کی ذات میں بھی انسانی

صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے، اوراس کے معاشرہ میں بھی نکھار پیدا ہوتا ہے۔لیکن مذہب میں اس کی آزادی اورخود فیصلہ لینے کی صلاحیت کوکچل کرر کھ دیا جاتا ہے۔آپ فقہ کی کسی کتاب کواٹھا کر دیکھئے۔اس میں انسان کے ایک ایک قدم کے لئے متعین ''شرعی احکام'' منضبط ملیں گے۔بیٹھواس طرح۔اٹھواس طرح۔چلواس طرح۔سوؤاس طرح،کھاؤاس طرح پیواس طرح۔ غسل اس طرح کرو۔بیت الخلاء میں یوں جاؤ۔حتیٰ کہ اس میں میاں بیوی کے جنسی اختلاط کے لئے بھی قواعدوضوابط ہوں گے۔ان قواعدوضوابط کی پابندی میکانکی طور پر کی جائے گی کیونکہ ان سے مقصد،ان کی پابندی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔نتیجہ یہ کہ جوشخص جتنا زیادہ ان حکام کا پابند ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا (76:10)۔۔۔قسم کی چوبِ خشک بن جائے گا جس میں انسانی زندگی کی لوچ اور لچک کا شائبہ تک نہیں ہوگا۔دہلی میں ایک بہت بڑے مفتی صاحب تھے۔ان کی بدنصیب بیوی اکثر بیمار رہتی تھی۔وہ ایک دن اس سے کہہ رہے تھے کہ نکاح نامہ کی رُو سے تمہارا نان ونفقہ تو میرے ذمے ہے، علاج معالجہ نہیں۔اس کے لئے تمہیں اپنے ماں باپ سے کہنا ہوگا۔اس قسم کی بن جاتی ہے ''فطرت'' ان لوگوں کی جو احکامِ شریعت کی پابندی اس طرح کرتے ہیں۔پھر، چونکہ یہ اپنے آپ کو بے حد متقی اور پرہیز گار سمجھتے ہیں۔اس لئے ان میں بے حد تکبر اور نخوت پیدا ہوجاتا ہے۔وہ ساری دنیا سے خفا رہتے اور دوسروں کونفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں' کیونکہ وہ ان کی نگاہ میں فاسق وفاجر' جہنم کے کندے ہوتے ہیں۔اس سے وہ عجیب قسم کی مخلوق بن جاتے ہیں جن میں نہ زندگی کی لطافت ہوتی ہے، نہ انسانیت کی لچک۔بیوروکریسی کی طرح ان کی بھی اپنی الگ برادری ہوتی ہے۔جس طرح اُن کے ہاں (D.F.A) اور (P.U.C) کے سوا کوئی موضوع گفتگو نہیں ہوتا۔ان کے ہاں بھی ساری زندگی ''مکروہ اور مباح'' کی بحثوں میں سمٹ اور سمٹا کر رہ جاتی ہے اوران کے فتوؤں میں انسانی زندگی کہیں جگہ نہیں پاتی۔یہ انسان نہیں ''قرآن کے الفاظ میں ''خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ'' (63:4) بن کررہ جاتے ہیں۔

> مجسٹریٹ نے چوری کے مجرم کو چھ ماہ کی قید کا حکم سنا دیا۔ ضابطہ تعزیرات کی رُو سے یہ بالکل ٹھیک تھا۔ یہ مجرم، اپنے بیوی بچوں اور بوڑھے ماں باپ کا واحد کفیل تھا۔ قانون نے اپنا تقاضا پورا کرلیا لیکن کسی نے یہ نہ دیکھا کہ چھ ماہ تک اتنے بڑے غریب خاندان کی روٹی کا کیا ہوگا!

❁❁❁❁❁

نظامِ عدل:

مذہب کی بات چھڑی تو معاملہ دُور تک جا پہنچا۔قرآنِ کریم نے بھی قواعد وضوابط اور احکام وقوانین دیئے ہیں' اوران کی پابندی ضروری قرار دی ہے۔ان احکام وقوانین کی رُو سے معاشرہ میں نظامِ عدل قائم ہوتا ہے' اور نظامِ عدل کوقرآن نے بڑی اہمیت دی ہے۔لیکن قرآنی نظامِ عدل اور بیوروکریسی کے نظامِ عدل میں بنیادی فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ بیوروکرٹیک نظام میں نہ مجرموں کو انسان سمجھا جاتا ہے، نہ جج کے سینے میں دھڑکنے والا دل ہوتا ہے۔اس میں ضابطہ ٔقوانین کی حیثیت اور کیفیت

اس پمفلٹ کی سی ہوتی ہے کہ جس میں مشین کی تفصیلات درج ہوتی ہیں۔ جج اس مشین کا اپریٹر ہوتا ہے، جو آنکھیں بند کر کے اس کی ہتھی گھما دیتا ہے۔ اس میں انسانی (Consideration) کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ بات دو ایک مثالوں سے واضح ہوجائے گی۔ ایک کا تعلق قانونِ شریعت سے ہے، دوسری کا ملکی قانون سے۔

فتویٰ:

ایک شخص غصے سے مغلوب ہو کر اپنی بیوی کو طلاق، طلاق، طلاق کہہ دیتا ہے۔ غصہ فرو ہونے پر وہ اپنی حماقت پر نادم ہوتا ہے اور مفتی صاحب سے پوچھتا ہے کہ اس غلطی کے ازالے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ وہ فرماتے ہیں کہ شریعتِ حقہ کی رُو سے اس کی ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ تمہاری بیوی کسی اور شخص سے نکاح کرے۔ ایک رات کی ''شب باشی'' کے بعد وہ اُسے طلاق دے دے اور اس کے بعد تم اس سے دوبارہ نکاح کرو۔

یہ سُن کر پانچ چھ بچوں کی ماں، پچاس سالہ بڑھیا پر قیامت گزر جاتی ہے۔ وہ اس قسم کی بے غیرتی کا تصور تک نہیں کرسکتی۔ وہ روتی ہے، بلبلاتی ہے اور مفتی صاحب سے کہتی ہے کہ غلطی اور حماقت تو اس کے خاوند نے کی اور اس کی اس قدر شرم ناک سزا اسے دی جارہی ہے۔ کس جرم کی پاداش میں؟ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ میں کیا کرسکتا ہوں۔ فقہ میں ایسا ہی کہا گیا ہے۔ شریعت کا یہی حکم ہے۔ میں اس میں تبدیلی نہیں کرسکتا۔

قطعِ نظر اس کے کہ یہ شرعی حکم بھی ان حضرات کا خودساختہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس شریعت میں اس قسم کی مظلوموں کی غیرت وحمیت کی کوئی گنجائش نہیں؟ یہ عفت مآب، انسان نہیں، مشین ہے! مفتی صاحب ان سوالات کا جواب دینے کے لئے اپنے آپ کو مکلّف نہیں پاتے۔ وہ فتوے صادر فرما دیتے ہیں اور مطمئن ہوجاتے ہیں کہ انہوں نے شریعتِ حقہ کا تقاضا پورا کر دیا۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذَالِكَ!

سزا کس کو ملی؟:

مجسٹریٹ نے چوری کے مجرم کو چھ ماہ کی قید کا حکم سنا دیا۔ ضابطہ تعزیرات کی رُو سے یہ بالکل ٹھیک تھا۔ یہ مجرم، اپنے بیوی بچوں اور بوڑھے ماں باپ کا واحد کفیل تھا۔ قانون نے اپنا تقاضا پورا کرلیا لیکن کسی نے یہ نہ دیکھا کہ چھ ماہ تک اتنے بڑے غریب خاندان کی روٹی کا کیا ہوگا! مجرم کو تو اپنے جرم کی سزا ملی، لیکن اس خاندان کو کس جرم کی پاداش میں یہ سزا ملی؟۔۔۔ اور سزا بھی ایسی جو مجرم کی سزا سے بھی زیادہ سخت ہے۔ مجرم کو جیل خانہ میں التزاماً روٹی ملتی رہے گی لیکن اس خاندان کی روٹی کی ذمہ داری کسی کے سر پر نہیں ہوگی! قانون اور عدالت کی نگاہوں میں یہ انسان ہیں ہی نہیں! مجرم کے بچے بھوک سے مرجائیں گے تو اس سے اس مجسٹریٹ (یا واضعین قانون) کے دل میں نہ کوئی کھٹک پیدا ہوگی، نہ ان سے کسی قسم کی باز پُرس ہوگی!

قرآنی نظامِ عدل:

قرآنی نظامِ عدل میں، انسانی پہلو کو مقدم رکھا گیا ہے۔ اس نظام کا مقصد فرد اور معاشرہ کی اصلاح ہے، اس لئے قوانینِ

خداوندی میں بھی اسی پہلو کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے اور ان قوانین کے اطلاق میں بھی اسی پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یعنی اس میں جج صاحبان کا فریضہ یہ نہیں ہوتا کہ ان قوانین کو مشین کی طرح نافذ کر دیا جائے۔ ان کا فریضہ یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ قانون کی مذکورہ بالا غرض و غایت کس طرح پوری ہوتی ہے۔ یعنی قانون اس غرض و غایت کے حصول کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ ہم پہلے دو ایک مثالیں اس امر کی پیش کریں گے کہ قانون سازی کے سلسلہ میں انسانی پہلوؤں کی کس قدر رعایت رکھی گئی ہے اور اس کے بعد یہ بتائیں گے کہ قرآن کے تعزیراتی قوانین کے اطلاق میں اس پر کس قدر زور دیا گیا ہے۔ پہلے قانون سازی کا گوشہ لیجئے۔

قرآنی قوانین

(1) تاریخ اجراء سے پہلے:

قرآن کا پہلا اصول یہ ہے کہ قانون کا اطلاق اس کی تاریخِ اجراء سے ہوگا۔ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا، ہو چکا۔ اس پر کوئی گرفت نہیں کی جاسکتی۔ اس نے جہاں بھی کسی نئے قانون کا تعین کیا ہے، ساتھ ہی کہہ دیا ہے: (4:23؛ 8:38؛ 2:275) ''پہلے جو ہو چکا، ہو چکا۔ سوچئے کہ اس سے افرادِ معاشرہ کو کس قدر اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

(2) قانون سے عدمِ واقفیت:

سیکولر قانون یہ ہے کہ قانون سے عدم واقفیت، اس کی خلاف ورزی کی وجہ جواز نہیں ہو سکتی۔ مجرم قانون سے واقف ہو یا نہ، اسے بہرحال سزا مل رہے گی۔ قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو خلاف ورزی قانون سے ناواقفیت کی بنا پر سرزد ہو، وہ ناقابلِ معافی ہے۔ افرادِ معاشرہ کو قانون سے آگاہ کرنا، حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اگر حکومت اپنی اس ذمہ داری کے پورا کرنے میں قاصر رہتی ہے تو اس کی سزا افرادِ معاشرہ کو کیوں ملے؟ (6:54؛ 16:119)۔

(3) ارتکابِ جرم میں دل کا ارادہ شامل ہو:

اگلا اصول یہ ہے کہ ارتکابِ جرم میں دل کا ارادہ شامل ہو، وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ط (2:225؛ 5:33) اس سے دیکھئے کہ مقدمہ کا فیصلہ کرنے والے جج پر کس قدر ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ وہ کسی مشین کی نقل و حرکت کا فیصلہ نہیں کر رہا۔ انسانوں کے عمل و اقدام کا جائزہ لے رہا ہے۔ اس کے لئے احوال و کوائف اور نفسیاتِ انسانی کی جن گہرائیوں تک جانے کی ضرورت ہوگی، وہ ظاہر ہے۔

(4) اضطراری حالت:

قرآنِ کریم نے جہاں کھانے پینے کی چند ایک چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، وہاں ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے کہ: فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ط (2:173) یعنی اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کھانے کے لئے اور کچھ نہ ملے اور تم (جان بچانے کے لئے) مجبور ہو جاؤ، تو ایسی حالت میں ان چیزوں کو بھی کھا سکتے ہو جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے، بشرطیکہ تم واقعی مجبور ہو جاؤ اور تمہاری نیت قانون شکنی اور یا ہوس پروری کی نہ ہو۔

قرآنِ کریم نے یہ استثناء بہ نصِ صریح کھانے پینے کی چیزوں کے ضمن میں روا رکھی ہے لیکن بعض دوسرے حالات میں بھی اضطراری حالت پیدا ہوسکتی ہے مثلاً حفاظتِ خود اختیاری کے لئے کسی کو قتل کر دینا۔ جج صاحبان کے لئے یہ متعین کرنا بھی ضروری ہوگا کہ ایسا عمل اضطراراً کیا گیا ہے۔ اس کے لئے بھی گہرے غور و تدبر اور انسانی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہوگی۔

واضح رہے کہ یہ اضطراری گنجائش ہر تقاضے کے لئے نہیں ہے۔ مثلاً اس نے بھوک پیاس کی صورت میں تو اضطرار کو تسلیم کیا ہے، جنسی تقاضوں میں اسے تسلیم نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس نے کہا ہے کہ اگر جائز طریق سے جنسی تقاضے کی تسکین کی صورت نہ ہو، تو ضبطِ نفس سے کام لیا جائے (24:33)۔ لہٰذا اضطرار کوئی ایسی گنجائش نہیں کہ جہاں جی چاہے اس سے فائدہ اٹھا لیا جائے اور اس طرح ہر ناجائز کام کو جائز قرار دے دیا جائے۔ فیصلہ کرنے والی اتھارٹی کو اس باب میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوگی۔

❁❁❁❁❁

اب آیئے تعزیرات کی طرف۔ اس نے کہا ہے کہ جس شخص کے خلاف کسی جرم کے ارتکاب کا الزام عائد کیا جائے، اس کے خلاف پہلا ردِ عمل یہ ہونا چاہئے کہ ہوسکتا ہے یہ الزام جھوٹا ہو۔ یعنی پہلا ردِ عمل اسے مجرم تصور کرنے کا نہیں، بلکہ محض ملزم تصور کرنے کا ہونا چاہئے۔ سورۃ النور میں جہاں اس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے جسے عام طور پر واقعہ اِفک کہا جاتا ہے (اور جہالت یا سازش کے تحت، حضرت عائشہؓ کو اس میں ملوث قرار دیا جاتا ہے) وہاں دو بار سختی سے کہہ دیا کہ جب فتنہ پردازوں نے اس فتنہ کو ہوا دی تھی تو تمہیں بلا ساختہ کہہ دینا چاہئے تھا کہ: هٰذَآ اِفۡكٌ مُّبِيۡنٌ (24:12)، هٰذَا بُهۡتَانٌ عَظِيۡمٌ (24:16)۔ یہ محض تہمت تراشی ہے۔ یہ بہتان ہے آپ غور کیجئے کہ اس سے ملزم اور معاشرہ پر کیسا خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں کے سیکولر نظام میں، جو کچھ "ملزموں" کے ساتھ ہوتا ہے (یعنی جنہیں محض شبہ کی بنا پر شاملِ تفتیش کرلیا جاتا ہے اور آگے چل کر ثابت ہوجاتا ہے کہ وہ بے گناہ ہیں) کہ اکثر اوقات وہ اس اذیت سے بچنے کے لئے یا تو جھوٹا اقبال جرم کر لیتے ہیں اور یا (بعض اوقات) خودکشی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

معاشرہ، انتظامیہ اور عدالت کی طرف سے اس ردِ عمل (یعنی ملزم کو بے گناہ سمجھنے) کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملزم کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہیں لگتی۔ قرآنی نظام کی غایت، احترامِ آدمیت کا برقرار رکھنا ہے۔ ملزم تو ایک طرف، وہ تو مجرم کو بھی نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا! بلکہ اس کی لغزش پر اس سے اظہارِ ہمدردی کرتا ہے۔ مجرموں کی تباہی پر، خود خدا بے ساختہ پکارتا ہے کہ: يٰحَسۡرَةً عَلَى الۡعِبَادِ (36:30) "اور میرے بندو! کس قدر تاسف انگیز اور حسرت ناک ہے تمہاری یہ حالت!" وہ جرم سے نفرت کی تلقین کرتا ہے، مجرم سے نہیں اور ان دونوں میں فرق کرنا عمیق بصیرت چاہتا ہے۔ قرآنی نظامِ عدل کا یہی تقاضا ہے۔ بعض جرائم ایسے شنیع ہوتے ہیں کہ اُن سے مستغیث کے دل میں غصے کے جذبات اُبھر آتے ہیں۔ قرآنِ کریم مومنین کی صفات یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ ایسی حالت میں بھی عفو اور درگزر سے کام لیتے ہیں۔ (42:37) حضرت عمرؓ نے اسی بنا پر کہا تھا کہ کسی کے صحیح کردار کا معلوم کرنا ہو تو اسے غصے کی حالت میں پرکھنا چاہئے۔

معافی:

اب ہمارے سامنے وہ مقام آتا ہے جہاں قرآنی نظام، دنیا کے ہر نظامِ عدل سے منفرد نظر آتا ہے۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) قرآنی نظامِ عدل کی غایت افراد اور معاشرہ کی اصلاح ہے، وہ اسے ترجیح دیتا ہے کہ یہ مقصد بغیر سزا کے حاصل ہو جائے اور سزا وہیں دیتا ہے جہاں ایسا کرنا ناگزیر ہو۔ اثباتِ جرم کے بعد معاف کر دینے کو عام طور پر رحم (Mercy) کہا جاتا ہے، اور چونکہ عدل اور رحم متضاد عناصر ہیں، اس لئے رحم کو نظامِ عدل کا جزو نہیں قرار دیا جاتا۔ اسے ''ترحمِ خسروانہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ میں آگے چل کر اس کی وضاحت کروں گا کہ یہ تمام تصورات غیر قرآنی ہیں۔ قرآن میں اس قسم کے رحم کا تصور نہیں۔ سر دست میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قرآنی نظامِ عدل میں سزا اور معافی دونوں کو ہمکنار رکھا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (5:98؛40:3)۔'' اسے اچھی طرح سمجھ رکھو کہ خدا مجرموں کا مؤاخذہ کرتے میں بڑا سخت گیر ہے اور اس کے ساتھ ہی معاف کر دینے میں بھی بڑا وسیع الظرف ہے۔''

آگے بڑھنے سے پہلے، دو ایک اہم نکات کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(1) قرآنِ کریم نے خدا کی جن صفات کا ذکر کیا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ مومنین میں (علیٰ حدِ بشریت) ان صفات کا منعکس ہونا ضروری ہے اور اس کی محسوس شکل یہ ہے کہ ان کا نظام، ان صفات کا مظہر ہو۔ یعنی اس نے جب کہا ہے کہ خدا شدید العقاب بھی ہے اور غفور رحیم بھی، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی نظام کو ان ہر دو خصائص کا حامل ہونا چاہئے۔ یعنی مجرمین کی گرفت کرنے والا بھی اور معاف کر دینے والا بھی۔

(2) چونکہ ہمارے مرّوجہ اسلام کے تصورات اور مسالک دورِ ملوکیت کے وضع کردہ ہیں، اس لئے اس معاشرہ میں، صفاتِ خداوندی کے انعکاس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ استبدادِ ملوکیت کے حامل معاشرہ میں ''خدا'' کا کیا کام؟

مغفرت کے معنی:

اس سے، سوال یہ پیدا ہوا کہ قرآن میں جو صفاتِ خداوندی کا اس قدر ذکر ہے تو اس کا مطلب اور مقصد کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ان صفات کا ظہور آخرت میں ہوگا۔ خدا کافروں کو جہنم رسید کرے گا اور مسلمانوں کے گناہ بخش کر انہیں جنت میں داخل کر دے گا۔ ''بخش دینے'' کی اصطلاح قابلِ غور ہے۔ کیونکہ اس کے گرد ہمارے تصورِ مکافاتِ عمل کی ساری عمارت گردش کرتی ہے۔ ''بخشیش'' کا لفظ تو آپ نے سنا ہوگا۔ یعنی جو چیز بطورِ استحقاق (AS OF RIGHT) نہ ملے۔ بطورِ خیرات ملے۔ اس سے خدا کے بخش دینے کا تصور قائم ہوا۔ یعنی اعمال کے لحاظ سے تو ہم جہنم کے مستوجب ہوں گے لیکن خدا ہمارے گناہ ''بخش دے گا'' اور اس طرح ہمیں جنت بطورِ خیرات مل جائے گی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں: ؎

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم است
بہشتے بہرِ اربابِ ہمم است
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش!
بہشتے فی سبیل اللہ ہم است

اور یہیں سے مغفرت کا ترجمہ ''بخشش'' اور غفور کا ترجمہ ''بخشنے والا'' کر دیا گیا۔

تاریخ کے اولیں دَور سے آج تک، بادشاہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو اختیارات واقتداراتِ خداوندی کا حامل سمجھا اور منوایا ہے۔ ہندوؤں کے راجہ ایشور کے اوتار تھے۔ عیسائیوں کے شاہنشاہ، حقوقِ خداوندی (Divine Rights) کے علمبردار۔ مسلمانوں کے سلاطین، ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ)۔ ان اختیارات کی رُو سے، مملکت کی ہر شے، بادشاہ کی ملکیت ہوتی تھی اور رعایا کو جو کچھ ملتا تھا، اس کی طرف سے ''بخشش'' کے طور پر ملتا تھا۔ انسان کی سب سے قیمتی متاع، اس کی جان ہوتی ہے۔ سلاطین کے اس منصب کی رُو سے، افراد کی جان بھی، ان کی ملک ہوتی تھی اور افراد کے پاس ان کی طرف سے بخشیدہ۔

ترحمِ خسروانہ!

قرآن میں بیان کردہ داستانِ حضرت ابراہیمؑ میں جب انہوں نے بادشاہ سے کہا کہ میرا خدا وہ ہے جس کے ہاتھ میں موت اور زندگی ہے، تو اس نے کہا تھا کہ: اَنَا اُحۡیٖ وَ اُمِیۡتُ ؕ (2:258) نہیں! افراد کی موت اور حیات میرے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ وہ جسے چاہتا۔۔۔ موت کی سزا دے دیتا۔ پھر مجرم اس کے حضور، روتا۔ چیختا۔ گڑگڑاتا۔ نہ صرف ہاتھ جوڑتا بلکہ سجدے بھی کرتا اور انتہائی عجز و لجاجت سے کہتا۔۔۔ کہ حضور میری جان بخشی کر دیجئے۔ اور اس کا ایک اشارۂ ابرو، اس کی ''جان بخش دیتا۔'' اس سے درحقیقت تذلیلِ انسانیت مقصود تھی۔ بادشاہ اپنے مخالفین کو ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ یہ حقوق ہر دَور کے شاہنشاہوں نے اپنے لئے مخصوص رکھے۔ حتیٰ کہ آج کی مہذب دنیا میں بھی، جہاں دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ ملوکیت کا خاتمہ ہو چکا ہے، تمام دنیا کے دساتیر (Constitutions) میں سزائے موت پانے والے مجرموں کی ''رحم کی درخواست'' منظور یا مسترد کرنے کا اختیار سربراہِ مملکت کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ وہی نمرود کے تمرد کی صدائے بازگشت ہے۔ وہی روحِ ملوکیت ہے جو آئینی پردوں میں رقصاں ہے اقبالؒ کے الفاظ میں: ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

اس ''ترحمِ خسروانہ'' سے جان تو بخشیش میں مل جاتی ہے لیکن انسانیت کی جس قدر تذلیل ہوتی ہے اس کا اندازہ ہر قلبِ حساس کر سکتا ہے۔ ایک انسان کا اپنے جیسے انسان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہونا اور منتیں کرنا کہ حضور! میری جان بخشی کر دیجئے، اس سے بڑھ کر ایک طرف تمرد اور دوسری طرف تذلیلِ انسانیت اور کیا ہوگی۔ چنانچہ ہمیں تاریخ میں ایسے غیور ''مجرموں'' کے نام جلی حروف میں لکھے ملتے ہیں جنہوں نے جلاد کی تلوار پر پھانسی کے تختے کو قبول کر لیا لیکن اپنے ہی جیسے انسان (سربراہِ مملکت) سے جان کی بھیک مانگنا گوارا نہ کیا۔

غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ:

قرآنِ کریم نے تذلیلِ انسانیت کی اس رسمِ کہن کا خاتمہ کر دیا اور سزا سے معافی کو، کسی حاکم اعلیٰ کی خیرات کی جگہ، خود قانونِ تعزیرات کا جزو بنا دیا۔ یہ بہت بڑا انقلاب تھا جس سے قرآن نے دنیائے انسانیت کو آشنا کرایا۔ آپ کو قرآنِ کریم میں ہر جرم کی سزا کے بعد اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (2:199) لکھا ملے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قوانینِ خداوندی، شدید

العقاب (سخت مواخذہ) اور غفور رحیم (معافی) دونوں سے مرکب ہیں۔ واضح رہے کہ مغفرت کے معنی ''بخشش'' نہیں۔ اس کے معنی حفاظت ہیں اور غفور کے معنی، بخشنے والا نہیں بلکہ حفاظت کرنے والا ہیں۔ ظاہر ہے کہ قانون کی خلاف ورزی سے معاشرہ میں کچھ نقصان ہوتا ہے، اور خود مجرم کی ذات کا زیاں بھی۔ قرآنی قانون میں اس نقصان کی تلافی کی گنجائش (Provision) رکھ دی گئی اور اس طرح معاشرہ اور اس فرد کو جو نقصان پہنچا تھا، اس کی حفاظت کا سامان بہم پہنچا دیا۔

رحیم کے معنی ''رحم کرنے والا'' نہیں۔ اس کے معنی ہیں، سامانِ نشوونما بہم پہنچانے والا۔ خدا کے غفور رحیم ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کے قانونِ مکافات میں اس کی گنجائش رکھ دی گئی ہے کہ۔۔۔ ارتکابِ جرم سے مجرم کی ذات کا جو نقصان ہوا ہے اسے اس سے محفوظ بھی رکھا جائے اور اس کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما پانے میں جو کمی رہ گئی تھی (اور جس کی وجہ سے اس سے ارتکابِ جرم سرزد ہوا تھا) اسے بھی دُور کر دیا جائے۔

یہ ہے قرآن کی رُو سے معافی سے مراد، جس کی گنجائش ہر جرم کی سزا کے قانون میں موجود ہے۔ ''قانون کے اندر موجود'' ہونے کے معنی یہ ہیں کہ یہ معافی کسی انسان کی طرف سے، خیرات یا بھیک کے طور پر نہیں ملتی۔ مجرم اسے قانونی استحقاق (Legal Right) کے طور پر حاصل کرتا ہے۔ اس طرح اس کی عزتِ نفس بھی مجروح نہیں ہوتی۔

معافی کی شرائط:

لیکن یہ معافی یونہی نہیں مل جاتی۔ یہ ایک اہم شرط سے مشروط ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ: فَمَنۡ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِ ظُلۡمِهٖ وَاَصۡلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوۡبُ عَلَيۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (5:39) جو مجرم، ارتکابِ جرم کے بعد اپنے کئے پر دل سے نادم ہو اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کا عزم کرے (اور مجاز اتھارٹی اس کا اطمینان کر لے کہ اس کی اصلاح کا واقعی امکان ہے) تو اسے ''مغفرت اور رحمت'' کے حق سے نوازا جا سکتا ہے۔ سزا کا مستوجب وہ ہوگا جو جانتے بوجھتے جرم کا ارتکاب کرے اور اپنے جرم پر نادم ہونے کے بجائے، اس پر اصرار کرے۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ معافی کا حقدار وہ ہے: وَلَمۡ يُصِرُّوۡا عَلٰى مَا فَعَلُوۡا وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ (3:135) ''جسے خلاف ورزیٔ قانون کے نقصانات کا علم و احساس ہو۔ اور اس پر اصرار نہ کرے۔'' اس سے یہ بھی واضح ہے کہ قرآن میں جن سزاؤں کا ذکر ہے وہ آخری درجہ پر ''عادی مجرموں'' کے لئے ہیں۔ یعنی جو بار بار ارتکابِ جرم کریں۔

ان تصریحات سے یہ بھی واضح ہے کہ اسلامی نظام میں عدالت کی ذمہ داریاں کس قدر گراں بار ہیں۔ اُسے مشینوں کی طرح قانون کے الفاظ کی پیروی نہیں کرنی ہوتی۔ اسے بہت سے نرم و نازک انسانی گوشوں کا لحاظ بھی رکھنا ہوتا ہے اور قانون کے بہت سے مستور تقاضوں کو پورا بھی کرنا۔

❀❀❀❀❀

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نمائندہ چٹان کا پرویز صاحب سے انٹرویو

مندرجہ ذیل انٹرویو مرحوم شورش کاشمیری کی زیرادارت 'ہفت روزہ چٹان لاہور' کے نمائندہ جناب ممتاز لیاقت کے قلم سے 'چٹان' کے 23 جولائی 1973ء کے شمارے کے صفحات 9 تا 16 پر باتصویر شائع ہوا۔ اس شمارے کے سرورق پر غلام احمد پرویز مرحوم کی فل سکیپ رنگین تصویر تھی اور یہ انٹرویو 'سخن ہائے گفتنی و ناگفتنی' طلوع اسلام لاہور کے مدیر جناب غلام احمد پرویز' کے عنوان سے چھپا اور اس کی تصاویر جناب صلاح الدین چودھری نے بنائیں یہ انٹرویو ماہنامہ طلوع اسلام لاہور کے اگست 1973ء کے شمارے میں بھی شائع ہوا۔ قارئین کے شوق و مطالبہ اور اس کی افادیت اور اہمیت کے پیشِ نظر یہ انٹرویو دوبارہ طلوع اسلام لاہور کی زینت بنایا جارہا ہے۔ (مدیر)

سوال نمبر 1: (الف) اس وقت آپ کے نزدیک پاکستان اور اس قوم کا اہم ترین مسئلہ کیا ہے یعنی ایسا مسئلہ جو پاکستان کے لئے بقا اور استحکام کی خصوصیت رکھتا ہے۔ پھر ہم اس مسئلہ کے مثبت نتائج کیونکر حاصل کر سکتے ہیں۔

(ب) کیا اسلام حال یا مستقبل کے لئے ایک فعال قوت (Living Force) کی خصوصیت رکھتا ہے! جواب اثبات میں ہے تو اس خصوصیت کی بنیادیں کیا ہیں۔

جواب: ہم پاکستان میں ابھی تک ایک قوم (قرآن کریم کی اصطلاح میں امت واحدہ) نہیں بن سکے۔ ہم یا تو انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں اور یا زمانہ قبل از اسلام کی قبائلی زندگی۔ انفرادی زندگی میں اجتماعی مفاد کا تصور تک نہیں ہوتا اور قبائلی زندگی کا لازمی نتیجہ باہمی مخالفتیں' مخاصمتیں' عداوتیں' تصادمات' فسادات اور خون ریزیاں ہوتا ہے۔ میرے نزدیک ہمارا بنیادی اور سب سے اہم مسئلہ ان منتشر افراد اور متصادم گروہوں کو ایک قوم (امت واحدہ) کے قالب میں ڈھالنا ہے۔

> عملاً مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم قرار دے دیا لیکن زبانی دوقومی نظریہ کے الفاظ دہراتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ہم ایمان کے اشتراک کی بنا پر مسلمانوں کو ایک قوم (امت واحدہ) بنا سکے اور نہ ہی وطنیت کی بنیادوں پر ایک قوم متشکل کر سکے۔ قرآن کریم کی رو سے تذبذب اور منافقت کا فطری نتیجہ' حبطِ اعمال اور تخریب مآل ہوتا ہے

مغرب نے قومیت کا معیار وطن کا اشتراک قرار دیا تھا اور اسی معیار کے مطابق ہندوستان میں متحدہ قومیت کا تصور ابھرا تھا۔ قرآن کریم نے قومیت (تشکیلِ امت) کا معیار ایمان کا اشتراک قرار دیا۔ اس معیار کی رو سے ساری دنیا

کے انسان دوگروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔۔ایک گروہ ان افراد کا جو ایمان میں مشترک ہوں اور دوسرا ان کا جن کا ان کے ساتھ ایمانی اشتراک نہ ہو۔ بالفاظِ دیگر' قرآن کی رو سے دنیا میں دو ہی قومیں رہ جاتی ہیں۔۔مسلم اور غیر مسلم۔۔اسی کو

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآن کی بھی مختلف تعبیریں ہو سکتی ہیں' اس لئے غلط اور صحیح کے پرکھنے میں قرآنی معیار کے نتائج میں بھی فرق ہو سکتا ہے۔اس قسم کے اعتراضات درحقیقت قرآن کو سند و حجت تسلیم نہ کرنے کے لئے گریز کی راہیں ہیں۔

''دو قومی نظریہ'' کہا جاتا ہے' اس نظریہ کی بنیادوں پر ہم نے پاکستان کا مطالبہ' اور پھر اس مملکت کو حاصل کیا تھا۔لیکن حصول پاکستان کے بعد ہم نے خود ہی اس نظریہ کو خیر باد کہہ دیا' یعنی ہم نے پاکستان کی جغرافیائی حدود میں بسنے والے تمام لوگوں' مسلمانوں اور غیر مسلموں۔۔کو ایک قوم قرار دے دیا۔اگر ہم کھلے بندوں اس کا اقرار اور اعلان کر دیتے کہ ہمارا معیار قومیت' وطن کا اشتراک ہے نہ کہ ایمان کا' تو ہم اس بنیاد پر قوم کی تشکیل کر لیتے۔لیکن ہم نے کیا یہ کہ عملاً مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم قرار دے دیا لیکن زبانی دو قومی نظریہ کے الفاظ دہراتے رہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ہم ایمان کے اشتراک کی بنا پر مسلمانوں کو ایک قوم (امت واحدہ) بنا سکے اور نہ ہی وطنیت کی بنیادوں پر ایک قوم متشکل کر سکے۔قرآن کریم کی رو سے تذبذب اور منافقت کا فطری نتیجہ' حبطِ اعمال اور تخریب مآل ہوتا ہے۔یہی ہمارے ساتھ ہوا۔جب تک ہم اس باب میں ذہنی اور قلبی طور پر یکسو نہیں ہوتے ہم ایک قوم نہیں بن سکتے۔اگر ہم وطنیت کی بنیادوں پر ایک قوم بنانا چاہتے ہیں تو ہر چند یہ روش اسلام کے خلاف ہوگی' لیکن اس سے کم از کم مغربی انداز کی ایک قوم تو متشکل ہو جائے گی اور اگر ہم اسلام سے وابستہ رہنا چاہتے ہیں تو پھر دو قومی نظریہ کو دیانتداری سے عملاً نافذ کرنا ہوگا۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے' اس نظریہ کے دو گوشے ہیں۔ایک یہ کہ کوئی غیر مسلم' مسلم قوم کا فرد قرار نہیں پا سکتا اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے اندر نسلی' لسانی' وطنی' ثقافتی' سیاسی' مذہبی' غرضیکہ کسی میلان و رجحان کے تابع تفرقہ پیدا کرنا اسلام سے برگشتگی اور مملکت کے خلاف بغاوت کی دلیل ہوتا ہے' کیونکہ اس سے امت کی وحدت باقی نہیں رہتی۔جو توحید کا لازمی نتیجہ ہے۔قرآن کریم بہ نص صریح امت میں تفرقہ کو شرک قرار دیتا ہے۔اس مقصد کے لئے موجودہ مسلمانوں کو' کہ جن کی تعلیم و تربیت اسلام کی رو سے نہیں ہوئی' بہر حال از روئے قانون ایک قوم بنانا ہوگا۔یہ طریق کار ہنگامی اور عارضی ہوگا' مستقل اور پائیدار طریق عمل یہ ہوگا کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کریں کہ ایمان کے اشتراک کی رو سے وحدت امت' ان کے قلب کی آواز اور روح کی پکار بن کر ابھرے۔میں شروع ہی سے دو قومی نظریہ کا مبلغ اور نظام تعلیم میں اس قسم کی تبدیلی کا داعی چلا آ رہا ہوں۔میرے نزدیک اس مسئلہ کا اس کے سوا کوئی حل نہیں۔

(ب) اسلام ان ابدی اقدار خداوندی اور اصول سماوی سے عبارت ہے جو زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہیں۔اس لئے یہ دین (نظام حیات) ہر زمانے کے لئے

فعال قوت ہے۔ طلوع اسلام کی سابقہ سالانہ کنونشن میں میرے ایک خطاب کا عنوان تھا۔ ’’کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے‘‘۔ اس کا جواب نفی میں دیتے ہوئے میں نے بہ دلائل وشواہد بتایا تھا کہ قرآن کے پیش کردہ اصول زندگی اور نظریات حیات کس طرح عالم انسانیت کو متاثر کئے چلے آرہے ہیں اور انسانی ذہن کس طرح انہیں غیر شعوری طور پر قبول کئے جارہا ہے۔ قرآن کا نصب العین ان اقدار کی رو سے عالم بشریت کو ایک عالمگیر برادری میں متشکل کرنا ہے۔ ان اقدار میں احترام آدمیت اور مساوات انسانیہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اقوام عالم اپنی انفرادی مفاد پرستیوں اور گروہ بندانہ مصلحت اندیشیوں کے تباہ کن نتائج سے اب اس قدر تنگ آچکی ہیں کہ وہ اپنی خود پیدا کردہ تفریقات کو مٹا کر ایک عالمگیر برادری (Global Village) کی تشکیل کے لئے ترس اور تڑپ رہی ہیں لیکن اس کے لئے انہیں کوئی اساس نہیں مل رہی۔ قرآن وہ اساس محکم پیش کرتا ہے جو کبھی متزلزل نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ مفکرین عالم اب رفتہ رفتہ اسی نہج پر سوچ رہے ہیں۔

سوال نمبر 2: ہم اسلام کو ماضی کے گرد وغبار سے‘ جو ملوکیت‘ ملائیت اور تصوف سے پیدا ہوا ہے‘ کیوں کر نکال سکتے ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے حق و باطل اور غلط اور صحیح کے پرکھنے کے لئے اپنی کتاب (قرآن مجید) کو معیار قرار دیا تھا۔ یہی اسلام میں سند اور حجت ہے۔ زمانۂ نزول قرآن میں مختلف اقوام میں جو کچھ مذہب کے نام سے پیش کیا جاتا تھا۔ قرآن نے اپنے اس معیار کے مطابق اس کا جائزہ لیا اور صحیح کو غلط سے الگ کر کے رکھ دیا۔ اس طرح وہ دین اپنی حقیقی شکل میں دنیا کے سامنے آ گیا۔ جسے نوع انسانی کے لئے ضابطۂ زندگی قرار دیا گیا تھا۔ اس کے بعد‘ اس دین میں انسانی فکر اور دیگر مذاہب کے عقائد اور مسالک کو داخل کر کے اسے مذہب کی سطح پر لے آیا گیا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ہم آج اسی مقام پر کھڑے ہیں‘ جس مقام پر نزول قرآن کے زمانے میں مختلف اہل مذاہب تھے۔ لہٰذا دینِ حقیقی سے

> قرآن کریم میں جو مابعد الطبیعاتی حقائق آئے ہیں‘ ان کے سمجھنے میں تو انسانی فکر میں اختلاف ہوسکتا ہے‘ لیکن جن امور کا تعلق انسانی راہنمائی سے ہے (اور یہی قرآن کا بنیادی مقصد ہے) ان میں وہ بالکل واضح اور متعین تعلیم پیش کرتا ہے‘ جس کی مختلف تعبیریں ہو نہیں سکتیں۔ بشرطیکہ قرآن کو خود اس کے اپنے تجویز فرمودہ طریق سے سمجھا جائے

ان غیر اسلامی تصورات ومسالک کو الگ کرنے کے لئے آج بھی وہی طریق اختیار کرنا ہوگا جو اس زمانے میں اختیار کیا گیا تھا۔ یعنی اِس وقت جو کچھ اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا ہے‘ اسے قرآن کے ترازو میں تول کر دیکھ لیا جائے۔ جو کچھ اس پر پورا اترے‘ اسے صحیح سمجھ کر اختیار کرلیا جائے۔ جو غلط ثابت ہو۔ اسے مسترد کر دیا جائے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت نہ نزول قرآن کے زمانہ میں اس کے لئے آمادہ ہوئی تھی‘ نہ اب آمادہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ ’’دین‘‘ کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ’’مذہب‘‘ ہوتا ہے اسی بناء پر علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ اسلام مذہب کے خلاف احتجاج ہے۔ آپ کو

معلوم ہوگا کہ اپنی عمر کے آخری حصے میں ان کے پیش نظر اسلام کے متعلق ایک کتاب لکھنے کا پروگرام تھا' جس کا عمودی نکتہ یہی تھا۔ میں نے اس نظریہ کے مطابق انگریزی زبان میں ایک کتاب شائع کی ہے۔ جس کا نام ہے۔ (Islam: A Challenge to Religion) اسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور مغربی مفکرین بھی اس سے خاصے متاثر ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ دین اور مذہب کا یہ فرق ان کے سامنے پہلی مرتبہ آیا ہے۔

اس ضمن میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآن کی بھی مختلف تعبیریں ہوسکتی ہیں' اس لئے غلط اور صحیح کے پرکھنے میں قرآنی معیار کے نتائج میں بھی فرق ہوسکتا ہے۔ اس قسم

> حضرت علامہؒ نے' بہ تکرار و اصرار' اس حقیقت کو دہرایا ہے کہ ان کی فکر کا بنیادی سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ لہٰذا فکر اقبال سے وہ (اور صرف وہ) کتاب انصاف کر سکے گی جو ان کی پیش کردہ فکر کا جائزہ قرآنی فکر کی روشنی میں لے اور اسی بنیادی نکتہ کو اپنی تحقیق کا محور قرار دے

کے اعتراضات درحقیقت قرآن کو سند و حجت تسلیم نہ کرنے کے لئے گریز کی راہیں ہیں۔ قرآن کریم میں جو مابعد الطبیعاتی حقائق آئے ہیں' ان کے سمجھنے میں تو انسانی فکر میں اختلاف ہوسکتا ہے' لیکن جن امور کا تعلق انسانی راہنمائی سے ہے (اور یہی قرآن کا بنیادی مقصد ہے) ان میں وہ بالکل واضح اور متعین تعلیم پیش کرتا ہے' جس کی مختلف تعبیریں ہو نہیں سکتیں۔ بشرطیکہ قرآن کو خود اس کے اپنے تجویز فرمودہ طریق سے سمجھا جائے۔

سوال نمبر 3: کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ علمائے سلف کے رشحات و اذکار پر آپ کی تنقیدیں نئی پود کے دماغوں اور دلوں میں اسلام کی ارادت کو کمزور کرتی ہیں اور پرانے لوگوں میں اشتعال کا باعث ہوتی ہیں۔

جواب: دین کے معاملے میں میرا مسلک وہ ہے جسے میں نے سوال نمبر 2 کے جواب میں بیان کیا ہے یعنی اس وقت جو کچھ ہمارے ہاں (یعنی مسلمانوں میں) اسلام کے نام سے مروج ہے' میں اسے قرآن کے معیار کے مطابق پرکھتا ہوں اور جو عقیدہ' نظریہ' مسلک و مشرب اس کے خلاف جاتا ہے' اس کے متعلق کہتا ہوں کہ وہ اسلامی نہیں' غیر اسلامی ہے۔ میری تنقیدیں نہ علمائے سلف کے رشحات کے خلاف ہوتی ہیں' نہ خلف کے افکار کے خلاف۔ میری تنقیدیں ہر خلاف قرآن عقیدہ اور مسلک کے خلاف ہوتی ہیں۔ عقائد (خواہ وہ کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں) انسان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوتے ہیں' اس لئے وہ ان کے خلاف کچھ سننے کے لئے بہ آسانی تیار نہیں ہوتا۔ (آپ نے دیکھا نہیں کہ ہندو گائے کے خلاف بھی ایک لفظ تک برداشت نہیں کرسکتا' حالانکہ اس پر ساری دنیا ہنستی ہے۔) جو کچھ میں قرآن سے پیش کرتا ہوں' اس کی تردید کے لئے چونکہ ہمارے قدامت پرست طبقہ کے پاس دلائل و براہین نہیں ہوتیں' اس لئے وہ خود بھی مشتعل ہو جاتا ہے اور عوام کو بھی مشتعل کرتا ہے۔ اندریں حالات میرے لئے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو میں (اسوۂ رسول اللہ ﷺ کے اتباع میں) ان کے اشتعال کو برداشت کروں اور اپنے مشن پر استقامت سے قائم رہوں اور یا اس مشن کو چھوڑ دوں۔ یہ

دوسرا راستہ میرے لئے دین و دنیا میں روسیاہی کا باعث ہو گا۔ اس لئے مجھے لامحالہ اپنی روش پر گامزن رہنا ہو گا۔ میں اپنی عمر کا بیشتر راستہ قطع کر چکا ہوں اور اب تھوڑی سی منزل باقی رہتی ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مجھے اسی راستے پر استقامت سے گامزن رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں اتنی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی تنقیدات میں متقدمین یا متاخرین میں سے کسی کے خلاف کبھی بدتمیزی سے کام نہیں لیا۔ ہمیشہ تہذیب اور شرافت کے دامن کو تھامے رکھا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس سے ناراض ہوتا ہے کہ اسکے کسی بزرگ کی طرف منسوب کردہ کسی عقیدہ یا مسلک کے متعلق میں یہ کیوں کہتا ہوں کہ وہ خلاف قرآن ہے تو اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔

میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی کسی تحقیق کے متعلق کبھی یہ نہیں کہا کہ وہ حرفِ آخر ہے اور سہو و خطا سے پاک، میں ہمیشہ یہ کہتا ہوں کہ وہ بہرحال ایک انسانی کوشش ہے، جس میں سہو و خطا اور مزید غور و فکر کی ہمیشہ گنجائش ہوتی ہے۔ میں نے کوئی فرقہ بھی پیدا نہیں کیا کہ میری تحقیق میرے متبعین کے لئے سند اور حجت بن جائے۔ میں اپنے فکری نتائج کو پوری قوم کے سامنے پیش کرتا ہوں اور اسے دعوت غور و فکر دیتا ہوں۔ مقصد میرا یہ ہے کہ قوم میں سوچنے کی صلاحیت بیدار ہو اور وہ جس نظریہ یا عقیدہ کو قبول کرے علیٰ وجہ البصیرت قبول کرے۔ میری تنقیدات سے نئی پود کے دماغوں اور دلوں میں اسلام کی ارادت کمزور نہیں ہو رہی۔ اسلام سے ان کی ارادت ان عقائد و نظریات کی وجہ سے کم ہو رہی ہے جسے ہمارا قدامت پرست طبقہ اسلام کے نام سے پیش کرتا ہے۔ اسی سے وہ اسلام سے سرکشی اور برگشتگی کی حد تک پہنچ رہے ہیں۔ میری پیش کردہ قرآنی فکر سے ہزارہا نوجوان اسلام کے گرویدہ ہو چکے ہیں، اور یہ دائرہ دن بدن وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذالك۔

سوال نمبر 4: علامہ اقبالؒ سے متعلق پاکستان میں جو کتابیں مختلف اہل قلم کی معرفت منصۂ اشاعت پر آئی ہیں کیا وہ اقبالؒ کی فکر سے انصاف کرتی ہیں؟

جواب: میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ علامہ اقبالؒ سے متعلق پاکستان یا بیرون پاکستان جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں، وہ سب میری نظر سے گزر چکی ہیں۔ لیکن جتنی کتابیں دیکھنے کا مجھے موقع ملا ہے، میں (ان کتابوں کے مصنفین سے معذرت کے ساتھ) عرض کروں گا کہ میرے نزدیک وہ اقبالؒ کی فکر سے انصاف نہیں کر پائے۔ حضرت علامہؒ نے بہ تکرار و اصرار اس حقیقت کو دہرایا ہے کہ ان کی فکر کا بنیادی سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ لہٰذا فکر اقبال سے وہ (اور صرف وہ) کتاب انصاف کر سکے گی جو ان کی پیش کردہ فکر کا جائزہ قرآنی فکر کی روشنی میں لے اور اسی بنیادی نکتہ کو اپنی تحقیق کا محور قرار دے۔

سوال نمبر 5: پاکستان کے صوبائی تعصّبات کو روکنے کے لئے ہم کن نظریاتی بنیادوں کو قوم کے اجتماعی ضمیر سے ہم آہنگ کر سکتے ہیں؟

جواب: اصولی طور پر اس سوال کا جواب سوال نمبر ا کے جواب میں مل جائے گا۔ ہمارے ہاں صوبوں کی اصل و حقیقت اس سے زیادہ کیا ہے کہ انگریز نے انتظامی سہولتوں کی خاطر ملک کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ لیکن اب

ان صوبوں کی لکیریں ایک دوسرے کو ڈسنے کے لئے سانپ بن گئی ہیں۔ حتیٰ کہ جو حضرات تقسیم ہند سے پہلے پورے ہندوستان میں بسنے والے باشندوں کو ایک قوم قرار دیتے تھے اور اس پر انہیں شدت سے اصرار تھا' وہ اب مغربی پاکستان کی چار دیواری کے اندر ان صوبوں کی لکیروں کی بنیاد پر چار قومیتوں کے وجود کے داعی بن رہے ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے سوال کے جواب میں عرض کیا ہے' اصلاً اور اساساً تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم کے افراد ہیں لیکن' بہ حالات موجودہ' ایک مملکت کے اندر بسنے والے مسلمان تو ایک قوم تسلیم کئے جانے چاہئیں۔ مغربی پاکستان میں اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہوگا کہ ان صوبوں کی تفریق کو ختم کر کے پاکستان کو ایک ملک تسلیم کیا جائے اور ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر وحدت امت کے نظریے کو وہ اساس قرار دیا جائے' جس پر ہماری زندگی کی پوری عمارت استوار ہو۔ ون یونٹ اس سمت ایک اچھا قدم اٹھایا گیا تھا لیکن افسوس کہ انتظامی خرابیوں کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہو سکا اور تفریق پسند گروہوں نے اس کی ناکامی سے فائدہ اٹھا کر ملک کو پھر چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر نظریہ پاکستان پر دیانتداری سے عمل کیا جائے تو ہمارے اس چھوٹے سے ملک میں وحدانی انداز حکومت کیوں کامیاب ثابت نہ ہو سکے۔ باقی رہا قوم کا اجتماعی ضمیر' تو جیسے میں نے پہلے عرض کیا ہے' یہاں ابھی تک قوم ہی متشکل نہیں ہوئی تو اس کا اجتماعی ضمیر کہاں سے پیدا ہوگا؟ اجتماعی ضمیر پیدا ہوا کرتا ہے' وحدت فکر و نظر سے' جسے بالفاظِ دیگر' ایمان کہا جاتا ہے۔ ہماری ساری کوششیں افراد قوم میں اقدار خداوندی کی بنیادوں پر (جو قرآن کریم میں محفوظ ہیں) ہم آہنگئ فکر و نظر پیدا کرنے کے لئے صرف ہونی چاہئیں۔ اس کے سوا صوبائی تعصّبات کے ختم کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

سوال نمبر 5: ہمارا ادب (نثر و نظم) کس رخ پر جا رہا ہے؟

جواب: رخ' کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ سامنے کوئی متعین منزل یا نصب العین ہو۔ اس وقت قوم کے سامنے کوئی متعین نصب العین نہیں' اس لئے اس کی فکر کے کسی خاص سمت جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت ہر طرف انتشار ہی انتشار ہے۔ انتشار کے اسی بگولے میں ہمارا ادب بھی عفریتی ناچ' ناچ رہا ہے۔ یا یوں کہئے کہ اس بگولے کی زد میں آ کر بے مقصد حرکتوں میں مصروف ہے۔ جھکڑ میں ہواؤں کا رخ کب متعین ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ''ایمان'' تو ایک طرف' ''کفر'' کا بھی کوئی رخ متعین نہیں۔

سوال نمبر 7: آپ پر احادیث کے استخفاف کے الزام کی نوعیت میں صحیح اور غلط کا تناسب کیا ہے؟

جواب: آپ نے میرے خلاف اس الزام کی یاد تازہ کرا کر۔۔ اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے۔۔ جو شخص اس بستی تک کا نام بصد عقیدت و احترام لیتا ہو' جس کی خاک کے ذروں کو عالم انسانیت کی بلند ترین ہستی ﷺ کی پابوسی کا شرف حاصل ہے' اسکے متعلق یہ کہنا کہ وہ اس ذات اقدس و اعظم ﷺ کے ارشادات گرامی کا استخفاف کرتا ہے' میں سمجھتا ہوں کہ اس سے سنگین تر الزام کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ اس کی نوعیت میں صحیح اور غلط کے تناسب کا کیا سوال' یہ یکسر کذب اور افتراء ہے' جسے ایک منظم پروپیگنڈے کی رو

سے مسلسل پھیلایا گیا ہے اس پروپیگنڈے کی شدت اور وسعت سمجھ میں نہیں آ سکتی، جب تک میں کوئی مثال پیش نہ کروں۔ میں عام طور پر شخصیتوں میں نہیں الجھا کرتا لیکن چونکہ مثال میں شخصیت کا ذکر ناگزیر ہے، اس لئے اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔

محترم آغا شورش کاشمیری کی تالیف۔۔ فیضانِ اقبالؔ۔۔کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اس کا مقدمہ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے، وہ اپنے اس مقدمہ میں، بلا موقع اور محل، مجھے گھسیٹ لائے ہیں اور فرماتے ہیں۔

لاہور میں یہ بھی طلوع ہوا ہے کہ ایک شخص جو شخصیت رسول کی اہمیت گھٹانے پر مامور ہے اور دین کو کج رو امیر مسلمانوں کے سہل اور غیر ذمہ دار طرز زندگی کے مطابق ڈھالنے کے لئے ایک فرقے کی بنیاد رکھ چکا ہے، بدقسمتی سے اپنی مجلس کی رونق اشعار اقبال ہی سے بڑھا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص رسولؐ ہی کو نہیں مانتا اور اپنے آپ کو قرآن کا عمرؓ و ابوبکرؓ سے بہتر مفسر سمجھتا ہے، وہ اقبالؔ کو کیا مانے گا۔ مگر رونق بڑھانے کے لئے اشعار اقبال کو یہ بھی گاتا ہے۔ (ص :23۔22)۔

آپ غور کیجئے کہ ان چند سطروں میں کتنے الزامات ہیں جو میرے خلاف عائد کئے گئے ہیں اور ان میں سے ہر الزام کس قدر جگر پاش اور جاں سوز ہے، پھر یہ بھی سوچئے کہ جب، عوام کیا، خواص مسلمانوں تک کے سامنے کسی شخص کا یہ نقشہ کھینچا جائے تو انکا خون کس قدر نہیں کھولے گا؟ میں نے حسب معمول اس زہرافشانی کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر میرا دامن راستے کی ان خاردار جھاڑیوں میں الجھ جائے تو میں اپنی منزل کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکوں گا۔ لیکن طلوع اسلام کی سابقہ کنونشن میں کراچی کے ایک دوست نے اس کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ جو بعد میں طلوع اسلام میں شائع ہوا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا گیا تھا کہ ان کے پاس ان الزامات کا کوئی ثبوت ہے؟ واضح رہے کہ ڈاکٹر صاحب سے میری آج تک کبھی ملاقات نہیں ہوئی، وہ میرے درس یا کنونشن میں سامع کی حیثیت سے بھی

> ''خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا، آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرف انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ ان کی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے، اس کے بعد انسان کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی اور مشعل راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراط مستقیم ہے جس پر اس ذات اقدس و اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں

کبھی شریک نہیں ہوئے لہٰذا ان الزامات کا ثبوت میری تحریروں ہی سے پیش کیا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطوط میں اس کا اعتراف کیا کہ اس کا کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ لکھا (کیونکہ وہ اپنے خطوط کی نقول مجھے بھی بھیجتے رہے تھے۔) کہ ان کے خطوط شائع نہ کئے جائیں۔

آپ سوچئے کہ جب ڈاکٹر سید عبداللہ جیسا ذمہ دار شخص میرے خلاف بلاثبوت اس قسم کے سنگین الزامات عائد

کرنے میں کوئی باک نہیں سمجھتا تو مذہبی مکاتب کے شوریدہ سر طلبا یا افسانہ گو واعظ کس حد تک نہیں جا سکتے؟ اگر ڈاکٹر صاحب نے میری صرف ایک کتاب ہی پڑھ لی ہوتی جو حضور اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ پر مشتمل ہے اور جس کا نام۔ ''معراج انسانیت'' ہے اس امر پر دال ہے کہ میرے نزدیک مقام محمدیؐ کی رفعت وعظمت کیا ہے تو انہیں کم ازکم اس کا احساس ہو جاتا کہ وہ کس کے خلاف' کیا الزام عائد کر رہے ہیں۔ میں نے یہ سیرت اصولاً قرآن کریم سے مرتب کی ہے اور اس کی تائید میں وہ احادیث پیش کی ہیں جو ہمارے روایات کے مجموعوں میں موجود ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن جو بڑی تقطیع کے قریب نو سوصفحات پر مشتمل ہے' 1949ء میں شائع ہوا تھا اور ملک میں کافی مقبول اور مشہور ہوا تھا۔ میں یہ تفصیل اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اس قسم کی کتاب کا کم ازکم نام تو سید صاحب نے سنا ہوگا' اگر وہ پوری کتاب نہیں' اس کا ''مطلع انوار'' ہی ملاحظہ فرما لیتے تو انہیں اس کے آخر میں یہ سطور دکھائی دیتیں۔

''خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا' آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرف انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ ان کی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے' اس کے بعد انسان کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی اور مشعل راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراط مستقیم ہے جس پر اس ذات اقدس واعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ ؎

مقام خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰؐ رو

یہ تھا وہ حاصلِ بہارِ چمنِ کائنات کہ جس کا ظہور صبح بہارِ کائنات تھا۔''

یہ تھی ایک مثال اس پروپیگنڈہ کی جو میرے خلاف گذشتہ پچیس سال سے مسلسل جاری ہے۔

(2) احادیث کی پوزیشن یہ ہے کہ ان کے متعلق کسی کا بھی یہ دعویٰ نہیں کہ وہ من وعن حضور نبی اکرم ﷺ کے ارشادات ہیں۔ ان کے متعلق دعویٰ اور عقیدہ یہی ہے کہ وہ اقوال منسوب الی الرسول ہیں۔ اس فرق کی وضاحت سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

قولِ رسول اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں' لازماً ایک ہی چیز نہیں اور نہ ان روایات کو استفسار کے لحاظ سے آیاتِ قرآنی کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیاتِ قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں' بخلاف اس کے' روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبیؐ کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔ (رسائل ومسائل' حصہ اول' ص:270)۔

ان احادیث کے صحیح یا غلط ہونے کے معیار کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسولؐ اللہ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح اور غلط ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے۔ آپ (ان کے فریق مقابل) کے نزدیک ہر

اس روایت کو حدیث رسول مان لینا ضروری ہے' جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی حجت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (ایضاً ص:290)۔

احادیث کے متعلق میرا ابھی یہی مسلک ہے' اس فرق کے ساتھ کہ مودودی صاحب کے نزدیک اس بات کا فیصلہ کہ (فلاں حدیث جسے حضورؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے) صحیح ہے یا غلط ''مزاج شناسِ رسول'' کی نگہٴ بصیرت کرسکتی ہے اور میرا مسلک یہ ہے کہ

'کوئی روایت جو قرآن کریم کے خلاف ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس واعظم پر طعن پڑتا ہو' یا اس سے صحابہٴ کبارؓ کی سیرت داغدار ہوتی ہو' وہ روایت صحیح نہیں ہوسکتی۔

یہ ہے وہ معیار' جس پر میں احادیث کو پرکھتا ہوں اور جو اس معیار پر پوری نہیں اترتیں' ان کے متعلق کہتا ہوں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث ہو نہیں سکتیں' حضور ﷺ کی طرف ان کی نسبت غلط ہے۔ ان وضعی روایات میں ایسی بھی ہیں' جنہیں دیکھ کر انسان کی نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ جب میں مثال کے طور پر اس قسم کی وضعی روایات سامنے لاتا ہوں تو عوام کو یہ کہہ کر مشتعل کر دیا جاتا ہے کہ دیکھئے یہ شخص (معاذ اللہ) احادیث رسول اللہ ﷺ کا استخفاف کرتا ہے۔ (گنجائش مانع ہے ورنہ میں اس قسم کی روایات کی چند مثالیں بھی پیش کرتا)۔

سوال نمبر 8: کیا آپ ہماری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ مولنا ابوالاعلیٰ مودودی نے بہرحال (جزوی اختلافات سے قطع نظر) نئی نسلوں کے اذہان میں اسلام کے لئے ارادت کی حد تک پختگی پیدا کی ہے؟

جواب: معاف فرمایئے' مجھے نہ صرف یہ کہ آپ کی اس رائے سے اختلاف ہے بلکہ میری رائے اس کے بالکل برعکس ہے۔ میری رائے اور تجربہ یہ ہے کہ نئی نسل کے سمجھنے سوچنے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو مودودی صاحب نے اسلام سے بری طرح برگشتہ کیا ہے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ میری اس رائے سے سخت اختلاف کیا جائے گا لیکن میں کوئی بات بلا دلیل اور بلا ثبوت نہیں کہا کرتا۔ جو کچھ میں نے کہا ہے اس کے لئے میرے پاس دلائل اور شواہد ہیں۔ اس سلسلے میں میں اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مودودی صاحب سے میری کوئی ذاتی مخاصمت نہیں۔ ان کے ساتھ میرے نہایت خوشگوار تعلقات' ان کے قیام دکن کے دوران سے چلے آرہے تھے۔ وہ دہلی تشریف لاتے تو ان کا میرے ہاں آنا جانا رہتا۔ انکے دارالاسلام (پٹھان کوٹ) تشریف لے جانے میں میرا بھی ہاتھ تھا۔ (میں اس داستان کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ موضوع زیر نظر سے اس کا بنیادی تعلق نہیں) میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان کے شمالی ہند کی طرف منتقل ہونے تک اور اس کے بعد بھی ان کے ساتھ میرے تعلقات خوشگوار تھے لیکن جب انہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تو میں نے پہلے انہیں اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن جب اس پر بھی انہوں نے اپنی روش نہ بدلی تو مجھے لامحالہ ان کی مخالفت کرنی پڑی۔ پاکستان آنے کے بعد خود اسلام کے متعلق جو روش انہوں نے اختیار کی' اسکی مجھے بڑی شدت سے مخالفت کرنی پڑی کیوں کہ مجھے اس کا احساس تھا

کہ اس کے نتائج بڑے دوررَس اور خطرناک ہو سکتے ہیں۔ یہاں میں اس امر کی مزید وضاحت کردوں کہ میں نے نہ کوئی مذہبی فرقہ بنایا ہے نہ سیاسی پارٹی۔ نہ ہی میں عملی سیاسیات میں حصہ لیتا ہوں۔ اس لئے یہاں بھی ان کے ساتھ میری ذاتی مخاصمت یا رقابت کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ میری مخالفت اصولی ہے اور اس کا جذبہ محرکہ وہی ہے جس کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے۔ ان کے پیش کردہ اسلام کی دو امتیازی خصوصیات ہیں۔ ایک تو وہ ان کی مصلحتوں کے مطابق بدلتا رہتا ہے اور دوسرے اس سے ایسے شکوک وشبہات ابھرتے ہیں۔ جو رفتہ رفتہ ایک سوچنے والے ذہن کو اسلام سے برگشتہ کردیتے ہیں۔ ان کا پیش کردہ اسلام کس قدر تضادات کا مجموعہ اور شکوک وشبہات پیدا کرنے والے مواد کا مرکب ہے۔ اس کی تفصیل کے لئے ایک اچھی خاصی کتاب درکار ہوگی اور میں سمجھتا ہوں کہ ایسی کتاب کی بے حد ضرورت ہے۔ لیکن میں اس مقام پر اس کی دو چار مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ پہلے تضادات کو لیجئے۔

(1) تشکیل پاکستان کے بعد پہلے انتخابات (1950-5ء) میں منعقد ہوئے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کی جماعت انتخابات میں حصہ نہیں لے گی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے لکھا:

اب ہم کو اس امر میں کوئی شک نہیں رہا کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو سب سے بڑھ کر جن چیزوں نے گندا کیا ہے ان میں سے ایک امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعت اسلامی نے فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریق انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ جماعت اسلامی نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کرے گی۔ نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دے گی۔ نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو اور اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے، خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی ٹکٹ پر یہی نہیں بلکہ جماعت اپنی انتخابی جدوجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام الناس کے ذہن نشین کرے گی کہ امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نااہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب کبھی اور جہاں کہیں سامنے آئے، لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے۔ اس کو ووٹ دینا، اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔ (جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد مطبوعہ ترجمان القرآن، اکتوبر 1950ء)۔

اس کے بعد جب 1952ء کے دستور کے ماتحت انتخابات کا موقع آیا تو انہوں نے ان میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں لکھا:

جماعت اسلامی نے 1950-51ء کے انتخابات کے موقع پر ایک پالیسی کا اعلان کیا تھا اور وہ یہ تھی کہ امیدواری چونکہ اسلام میں ناجائز ہے، اس لئے ہم نہ خود امیدوار بن کر کھڑے ہوں گے اور نہ کسی امیدوار کو ووٹ دیں گے۔ بعد میں تجربات سے ہم کو معلوم ہوا کہ ہم ابھی اس پوزیشن میں نہیں کہ ہر ضمنی اور عام انتخابات میں پورے ملک کی ہر نشست کے لئے اپنے معیار مطلوب کے مطابق موزوں امیدوار کھڑے کرسکیں...... اس بنا پر ہم نے سابقہ پالیسی میں یہ تغیر کر دیا کہ ہم خود تو امیدوار بن کر کھڑے

ہونے سے بدستور مجتنب رہیں گے لیکن فاسد عناصر کے شر کو رفع کرنے اور ان کے مقابلے میں نسبتاً صالح اور اسلامی نظام کے حامی عناصر کو آگے بڑھانے کے لئے جن امیدواروں کی تائید ناگزیر محسوس ہوگی' انہیں ووٹ دیں گے بھی اور دلوائیں گے بھی۔

(ترجمان القرآن بابت مئی 1958ء)

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب کا یہ اعلان اس سے پہلے فیصلے سے یکسر متضاد ہے لیکن اس کے ساتھ انہوں نے فرمایا کہ:

ہر معقول آدمی بہ یک نظر محسوس کرے گا کہ ہماری یہ نئی پالیسی ٹھیک دینی نظام کے مطابق ہے اور اسمیں دراصل کوئی اصول شکنی نہیں کی گئی۔(ایضاً)۔

اس کے بعد 1970ء کے انتخابات کے موقع پر انہوں نے اعلان کیا کہ

جماعت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ آئندہ انتخابات میں حصہ لے گی اور مغربی اور مشرقی پاکستان کی تمام نشستوں پر اپنے آدمی کھڑے کرے گی۔(انتخابی منشور کے سلسلے میں مودودی صاحب کا بیان ۔۔)۔

(2) ایک مثال اور لیجئے۔ یہ سوال بڑا بنیادی ہے اور ہمارے زمانے میں اس نے خاص طور پر اہمیت حاصل کر لی ہے کہ اسلام کی رو سے ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت جائز ہے یا نہیں اور کیا حکومت کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ زمین کی انفرادی ملکیت کی تحدید کر دے۔ اس سلسلے میں مودودی صاحب نے اپنی کتاب (مسئلہ ملکیت زمین) میں لکھا تھا۔

اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں بلا حدونہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ و پیسہ' جانور' استعمال کی اشیاء' مکانات' سواری غرضیکہ کسی چیز کے معاملے میں قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے پھر آخر تنہا زرعی جائیداد میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملے میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوق ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک حد خاص سے زائد ملکیت کو آدمی کے لئے عملاً بیکار کر دے۔(مسئلہ ملکیت زمین' پہلا ایڈیشن' ص:53-52)۔

جہاں تک نیشنلائزیشن کا تعلق ہے۔ انہوں نے تحریر فرمایا تھا کہ:

اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہوتا ہے' جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا۔ (ایضاً ص:71)۔

لیکن 1970ء کے انتخابات کے موقع پر جب پیپلز پارٹی نے اس مسئلہ کو انتخابی مہم کا عمودی نکتہ بنا کر پیش کیا تو جماعت اسلامی نے اپنے منشور میں لکھا۔

قدیم املاک کے معاملے میں زمین کی ملکیت کو ایک خاص حد تک محدود کر دیا جائے گا۔ مغربی پاکستان کے زرخیز علاقوں میں یہ حد زمین کی پیداواری صلاحیت کے لحاظ سے سو اور دوسو ایکڑ کے درمیان ہوگی اور جن علاقوں میں زمین کی پیداواری صلاحیت بہت کم ہے وہاں اس معیار کے لحاظ سے حد مقرر کی جائے گی۔ مشرقی پاکستان میں سو بیگھہ کی حد

رکھی جائے۔

جہاں تک نیشنلائزیشن کا تعلق ہے' اس منشور میں کہا گیا کہ:

ہم قومی ملکیت کے نظام کو بطور اصول اختیار کرنے کے مخالف ہیں لیکن جن صنعتوں کو کلیدی اور بنیادی اہمیت حاصل ہے اور جن کا نجی حیثیت سے چلنا اجتماعی حیثیت سے نقصان دہ ہے' انہیں قومی ملکیت میں بہ معاوضہ لے لینے یا خود حکومت کے انتظام میں قائم کرنے اور چلانے کو ناجائز بھی نہیں سمجھتے۔

آپ سوچئے کہ جب ایک سنجیدہ' تعلیم یافتہ' نوجوان

> ''اسلامی تاریخ'' کی اصطلاح وضاحت طلب ہے۔ ایک چیز ہے اسلام کی تاریخ اور دوسری چیز ہے مسلمانوں کی تاریخ' اسلام کی تاریخ سے مراد یہ ہے کہ اسلام درحقیقت تھا کیا اور پھر وہ کس طرح رفتہ رفتہ مروجہ اسلام میں تبدیل ہوگیا۔ جہاں تک میرا علم میری راہنمائی کرتا ہے اسلام کی اس قسم کی تاریخ ابھی تک مرتب نہیں ہوئی۔

ان تضادات پر غور کرے گا اور ان کا اس دعویٰ کی روشنی میں جائزہ لے گا کہ یہ سب اسلام کے مطابق ہیں' تو اس اسلام کے متعلق وہ کس نتیجے پر پہنچے گا۔

اب اس مسئلہ کے دوسرے حصہ کی طرف آیئے اور دیکھئے کہ مودودی صاحب کا پیش کردہ اسلام اور تو اور خود حضور رسالتمآب ﷺ کی ذاتِ گرامی کے متعلق کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ کوئی پندرہ سولہ سال ادھر جماعت اسلامی کے کچھ اراکین نے جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ان میں اس جماعت کے بعض نہایت سربرآوردہ حضرات بھی شامل تھے۔ انہوں نے مودودی صاحب کے خلاف جو الزامات عائد کئے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا' کہ وہ اکثر غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا' کہ اگر میں نے یہ کچھ کیا ہے تو کون سا جرم کیا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ بھی (توبہ توبہ معاذ اللہ) یہی کچھ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے اصولی طور پر یہ لکھا کہ

راستبازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں' جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے۔ بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔

اس ''اصول'' کے بعد کہا:

اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں۔ کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمدؓ بن مسلمہ کو جب حضور نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں؟ حضورؐ نے بالفاظ صریح انہیں اس کی اجازت دے دی۔

(ترجمان القرآن' بابت مئی 1958ء)۔

میں یہاں اسے دہرا دوں کہ (جیسا کہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں) مودودی صاحب کے نزدیک ہمارے احادیث کے مجموعوں میں درج شدہ ہر حدیث صحیح نہیں ہے وہ صرف اسی حدیث کو صحیح مانتے ہیں' جسے ان کی نگہ بصیرت صحیح قرار

دے دے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ اس حدیث کو خود اپنی تحقیق کی رو سے تسلیم کرتے ہیں۔

ان کے خلاف دوسرا اعتراض یہ تھا کہ جماعت کی تاسیس کے زمانے میں وہ بڑے بلند آہنگ اصول پیش فرمایا کرتے تھے، لیکن جب وہ پاکستان میں اقتدار کے پیچھے پڑے تو انہوں نے ان تمام اصولوں کو پس پشت ڈال دیا۔ اس کے جواب میں بھی مودودی صاحب نے فرمایا کہ (معاذ اللہ) خود رسول اللہ ﷺ نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا۔

اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرق مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبان مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ الائمۃ من قریش۔۔ ''امام قریش میں سے ہوں گے''۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں یہ ہدایت مساوات کے اس اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ (رسائل و مسائل حصہ چہارم، ص: 30-329)۔

آپ سوچئے کہ جو کچھ مودودی صاحب فرما رہے ہیں، اس سے ہماری نئی پود کے سنجیدہ طبقہ کے ذہن میں، اسلام تو ایک طرف خود ذات رسالتمآبؐ کے متعلق کیا تصور پیدا ہو گا۔

ضمناً یہ دونوں روایتیں وضعی ہیں۔ اس لئے کہ یہ قرآن کریم کی تعلیم کے بھی خلاف ہیں اور حضور نبی اکرم ﷺ کی پاکیزہ اور بلند سیرت کے بھی منافی لیکن مودودی صاحب انہیں صحیح قرار دیتے ہیں کیونکہ اس سے انہیں اپنے موقف کی تائید حاصل ہوتی ہے اور ایسا کرنے میں یہ خیال انہیں قطعاً نہیں ستاتا کہ ان کے اس نشتر کی زد کہاں تک پہنچتی ہے وہ اکثر ایسا کرتے ہیں۔ اس قسم کی ہیں وہ روایات جن کی میں مخالفت کرتا ہوں اور جس کی پاداش میں مجھے منکر حدیث، منکر شانِ رسالت اور نہ جانے کیا کیا کہا جاتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ میں ان روایات کو غلط کیوں قرار دیتا ہوں بلکہ اس لئے کہ ان کے غلط قرار دینے سے خود مودودی صاحب بے نقاب ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔

اس کے بعد آیئے قرآنی حقائق کی طرف۔ مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن کی حال ہی میں تکمیل ہوئی ہے۔ اس پر جس شان کے جشن منائے گئے ہیں اور اس تفسیر کی تعریف میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس سے آپ واقف ہوں گے، لیکن دیکھئے کہ اس تفسیر میں کس قسم کا قرآن پیش کیا گیا ہے۔ صرف دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

(1) تفسیر کی پہلی جلد میں کہا گیا ہے (اور اس کی تفصیل اس سے پہلے مودودی صاحب اپنی کتاب تفہیمات حصہ دوم میں بھی بیان کر چکے ہیں) کہ جنگ میں گرفتار شدہ دشمن کی عورتوں کو سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے گا اور وہ ان سے بغیر نکاح اور بلا لحاظ تعداد جنسی تمتع کر سکیں گے اور جب جی چاہے انہیں فروخت بھی کر سکیں گے۔ (تفہیم القرآن، جلد اول 1951ء ایڈیشن، ص: 340 و تفہیمات حصہ دوم،

ص:292 سے آگے)۔

(2) جنت کی حوروں کے متعلق وہ اپنی تحقیق یوں پیش کرتے ہیں۔ ''بعید نہیں ہے کہ یہ وہ لڑکیاں ہوں جو دنیا میں سنِ رشد میں پہنچنے سے پہلے مرگئی ہوں اور جن کے والدین جنت میں جانے کے مستحق نہ ہوئے ہوں۔ یہ بات اس قیاس کی بنا پر کہی جاسکتی ہے کہ جس طرح ایسے لڑکے اہل جنت کی خدمت کے لئے مقرر کر دیئے جائیں گے اور وہ ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے' اسی طرح ایسی لڑکیاں بھی اہل جنت کے لئے حوریں بنا دی جائیں گی اور وہ ہمیشہ نوخیز لڑکیاں ہی رہیں گی۔ (تفہیم القرآن' جلد چہارم' ص:287)۔

(3) سورہ الرحمن کی آیت **حور مقصورات فی الخیام** کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں۔

خیموں سے مراد غالباً اس طرح کے خیمے ہیں' جیسے امراء و روساء کے لئے سیر گاہوں میں لگائے جاتے ہیں اغلب یہ ہے کہ اہل جنت کی بیویاں ان کے ساتھ قصروں میں رہیں گی اور ان کی سیر گاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے' جن میں حوریں ان کے لئے لطف ولذت کا سامان فراہم کریں گی۔ ہمارے اس قیاس کی بنا یہ ہے کہ پہلے خوب سیرت اور خوب صورت بیویوں کا ذکر کیا جا چکا ہے' اس کے بعد اب حوروں کے ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ ان بیویوں سے مختلف قسم کی خواتین ہوں گی۔

(تفہیم القرآن' جلد پنجم' ص:271)۔

میں انہی دو چار مثالوں پر اکتفاء کرتا ہوں ورنہ (جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے) اگر ان کے پیش کردہ اس قسم کے ''نوادرات'' کو یکجا کیا جائے تو اس سے ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب مرتب ہوسکتی ہے۔ اس کے بعد میں' اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس بات کا فیصلہ ارباب دانش وبینش پر چھوڑتا ہوں کہ اس سے نوجوانوں کے اذہان میں اسلام کے لئے ارادت پیدا ہوگی یا نفرت؟ اس سے پہلے صورت یہ تھی کہ جب کبھی کوئی نوجوان اس قسم کی لغویات پیش کرتا تو اسے سمجھا دیا جاتا۔ کہ یہ جہلاء کی باتیں ہیں' اسلام کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اب وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ اسلام وہ شخص پیش کر رہا ہے' جسے دنیائے اسلام کا عظیم ترین مفکر اور علوم جدیدہ پر وسیع نگاہ رکھنے والا محقق کہا جاتا ہے۔ لہٰذا آپ انہیں جہلاء کی باتیں کہہ کر مسترد نہیں کر سکتے اور اب تو یہ مصیبت اور بھی آگے بڑھ رہی ہے۔ اب مودودی صاحب کے اس تعارف کے ساتھ ان کی کتابیں انگریزی میں بھی منتقل ہو رہی ہیں' اس سے دشمنان اسلام کو اسلام پر وار کرنے کے لئے جس قسم کے حربے ہاتھ آجائیں گے' وہ ظاہر ہے۔ چونکہ عظمت قرآن اور ناموس رسالت کا تحفظ میرا جزو ایمان اور نصب العین حیات ہے اس لئے میں مودودی صاحب کے پیش کردہ اس قسم کے اسلام کی مخالفت اپنا فریضہ سمجھتا ہوں اور یہی وجہ ہے جو میرے خلاف اس قدر شدید پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔

سوال نمبر 9: کیا اسلامی وفاق کا قیام ممکن ہے۔ ممکن ہے تو کب' کہاں اور کس طرح۔ اس کا ابتدائی نقشہ کیا ہوگا؟

جواب: اسلامی ممالک کا وفاق اسی صورت میں ممکن ہے' جب ان کے دل میں اس حقیقت کو بیدار اور جاگزیں کیا جائے کہ اسلام میں قومیت کا معیار وطن اور نسل کا اشتراک نہیں بلکہ ایمان کا اشتراک ہے۔ اس معیار کی رو سے دنیا کے مسلمان الگ الگ قومیں نہیں بلکہ ایک امت ہیں۔ اس

حقیقت پر یقین کے بعد آغازِ کار کے لئے یہ ہوسکتا ہے کہ موجود مختلف مملکتیں انتظامی مقاصد کے لئے الگ الگ شکل میں قائم رہیں اور بنیادی امور کے لئے ان میں وفاق یا میثاق قائم کر دیا جائے اور پھر وہ رفتہ رفتہ ایک مرکز کے تابع آ جائیں۔ جب یہ مرکز قرآن کے تابع ہوگا تو اسے ''خلافت علیٰ منہاج نبوت'' کہا جائے گا۔

سوال نمبر 10: مختصراً وہ کون سی غلط اصطلاحیں، الفاظ اور عقائد ہیں جو اصل اسلام میں نہیں تھے لیکن صدیوں کی گردش سے بہمہ وجوہ مسلمانوں کے افکار کا حصہ ہو گئے ہیں؟

جواب: اس سوال کا جواب بڑی تفصیل چاہتا ہے، جس کی اس انٹرویو میں گنجائش نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں گذشتہ قریب تیس پینتیس سال سے اسی سوال کا جواب دینے میں اپنی زندگی صرف کر رہا ہوں۔

دین خدا کی طرف سے خالص اور منزہ شکل میں ملتا ہے۔ اس کے بعد اس میں دو بنیادی تبدیلیاں پیدا کرائی جاتی ہیں جن سے وہ مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک یہ کہ انسانوں کے خود ساختہ نظریات، معتقدات یا رسوم و مسالک کو (خود وضع کر کے یا دوسروں سے مستعار لے کر) دین کا جزو بنا دیا جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ دین کی اصطلاحات کا مفہوم بدل دیا جاتا ہے۔ اسلام بھی مذہب کی شکل اختیار کر چکا ہے جس میں یہ دونوں تبدیلیاں آ گئی ہوئی ہیں۔ دین کا صحیح نقشہ سامنے لانے کے لئے بنیادی طور پر کرنے کا کام یہ ہے کہ یہ بتایا جائے کہ ان مروجہ الفاظ اور اصطلاحات کا دین کی رو سے مفہوم کیا تھا اور اب ان سے کیا مفہوم لیا جاتا ہے۔ میں نے اپنی بساط اور بصیرت کے مطابق اپنی مرتب کردہ ''لغات القرآن'' میں یہی کیا ہے اور اپنی مختلف تصانیف میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ہمارے ہاں کون سے غیر قرآنی عقائد اور تصورات ہیں جو اسلام کا جزو بن چکے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے۔ اس کے لئے پورے کے پورے مروجہ اسلام کا جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں لینا ہوگا کہ ان تمام تحریفات اور تغیرات کے باوجود، خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اس نے لے رکھا ہے۔

سوال نمبر 11: اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں کن باتوں کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ہم اس کی اجتماعی روح سے آشنا ہوتے رہیں؟

جواب: ''اسلامی تاریخ'' کی اصطلاح وضاحت طلب ہے۔ ایک چیز ہے اسلام کی تاریخ اور دوسری چیز ہے مسلمانوں کی تاریخ، اسلام کی تاریخ سے مراد یہ ہے کہ اسلام درحقیقت تھا کیا اور پھر وہ کس طرح رفتہ رفتہ مروجہ اسلام میں تبدیل ہو گیا۔ جہاں تک میرا علم میری راہنمائی کرتا ہے اسلام کی اس قسم کی تاریخ ابھی تک مرتب نہیں ہوئی۔ باقی رہی مسلمانوں کی تاریخ تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد مسلمانوں کی سلطنتوں اور حکومتوں کی تاریخ ہے۔

عہدِ محمد رسول ﷺ اللہ والذین معہٗ کی تاریخ میں اسلام کی تاریخ اور مسلمانوں کی تاریخ میں فرق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس دور ہمایوں میں مسلمان اسلام کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس دور کی تاریخ بھی ہمارے پاس اپنی حقیقی اور غیر ملوث شکل میں نہیں آئی۔ ہمارے ہاں سب سے پہلی جامع تاریخ، تاریخ طبری ہے۔

جسے ام التواریخ کہا جاتا ہے۔ یہ تیسری صدی ہجری کے اواخر یا چوتھی صدی کے ابتداء میں، کسی سابقہ مستند تحریری ریکارڈ کے بغیر، روایات کی رو سے مرتب ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے اس میں رطب و یابس ہر قسم کی روایات موجود ہیں۔ اس کے بعد مرتب ہونے والی کتب تاریخ کی بنیاد بھی یہی تاریخ ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ اسلام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ وضعی احادیث اور ہماری تاریخ ہے ان میں ہر شخص کو اپنے اپنے نظریے کی تائید میں روایات مل جاتی ہیں جسے وہ اسلام کہہ کر دنیا کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ امت کے اختلافات، نزاعات، تفرقات اور غیروں کی طرف سے اعتراضات کا سرچشمہ بھی یہی چیزیں ہیں۔ جہاں تک عہد محمد رسول ﷺ اللہ والذین معہٗ کا تعلق ہے اس کی منزہ تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کبارؓ کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ ان کی زندگی قرآن کریم کے مطابق تھی لہٰذا ہمیں اس دور کی تاریخ کو قرآن کی چھلنی میں چھان لینا چاہئے۔ جو اس کے مطابق ہو۔ اسے صحیح سمجھ لینا چاہئے۔ جو اس کے خلاف جائے اسے مسترد کر دینا چاہئے۔ میں نے اپنی کتاب سیرت (معراج انسانیت) کو اسی معیار کے مطابق مرتب کیا ہے اور اس کا نتیجہ بڑا شاداب اور درخشندہ سامنے آیا ہے۔ اسے ہم پورے حتم و اعتماد کے ساتھ غیر مسلموں کے ہاتھ میں دے سکتے ہیں۔ اس نے ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل و دماغ میں عظیم انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

باقی رہی بعد کے دور کے مسلمانوں کی تاریخ تو نہ ہم ان کے اعمال و کردار کی صداقت کے لئے مکلف ہیں، نہ ہی انہیں اسلام کے لئے سند کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

سوال نمبر 12: کیا ہم یورپ کی علمی قیادت کو چیلنج کر سکتے ہیں۔ اگر چیلنج کر سکتے ہیں تو اس کی اساس کیا ہوگی اور اس کی زبان کیا ہونی چاہئے۔

جواب: یورپ (یا کسی اور قوم یا ملک) کی علمی قیادت کا سوال ایسا نہیں جسے کوئی بنیادی حیثیت حاصل ہو۔ علم الاشیاء (یعنی علم کائنات) کے حصول کی استعداد آدم (یعنی آدمی) کے اندر رکھ دی گئی ہے، جو قوم بھی اس صلاحیت اور استعداد سے کام لے گی وہ اس علم میں آگے بڑھ جائے گی، ایک وقت میں مسلمانوں نے اس سے کام لیا، امامت اقوام ان کے حصے میں آ گئی، اب یورپ کی اقوام نے اس سے کام لیا ہے تو وہ آگے بڑھ گئی ہیں۔ اگر مسلمان اس کے لئے پھر کوشش کریں گے تو یہ ان سے بھی آگے بڑھ سکتے ہیں۔

اصل سوال ان مقاصد کا ہے، جن کے لئے اس علم کو حاصل کیا جاتا، اور ان اقدار کا جن کے مطابق اس علم کو استعمال کیا جانا چاہئے۔ یہ مقاصد اور اقدار وحی کی رو سے متعین اور عطا ہوئی ہیں اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ جو قوم علم کو ان مقاصد کے لئے حاصل اور ان اقدار کے مطابق صرف کرے گی، نوع انسان کی امامت اس کے حصے میں آئے گی۔ باقی رہا زبان کا سوال سو قرآن کریم کی زبان عربی ہے، اس لئے اس سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے اس زبان کا جاننا ضروری ہے، جہاں تک علوم کائنات کا تعلق ہے اتفاق سے اس کا عظیم اور کثیر ذخیرہ انگریزی زبان میں ہے۔ اس علمی ذخیرہ سے متمتع ہونے کے لئے اس زبان کی تحصیل بھی ناگزیر ہے۔ جو قوم اس زبان سے (یا اس قسم کی کسی دوسری زبان سے جس میں یہ سرمایہ ہو) بیگانہ ہو جائے گی، وہ

اپنے آپ کو نوع انسان کے ایسے گراں بہا ورثہ سے محروم کرے گی' اور اس کی یہ کمی کسی اور طرح بمشکل پوری ہو سکے گی۔

سوال نمبر 13: اپنے دماغی ارتقاء کی سرگزشت بیان فرمایئے؟

جواب: اپنے ذہنی ارتقاء کی سرگزشت کے بارے میں اس کے سوا کیا کہوں کہ ؎

تفصیلِ معنیٔ غم الفت طویل ہے

اور ویسے تو خفیف سا اک دل میں درد ہے

میری پیدائش (1903ء میں مشرقی پنجاب کے قصبہ بٹالہ ضلع گورداسپور) کے ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جو شریعت اور تصوف دونوں کا گہوارہ تھا۔ میرے دادا حنفی مسلک کے ایک ممتاز عالم اور چشتیہ نظامیہ خانوادہ سے متعلق اکابر صوفیہ میں سے تھے۔ میری تعلیم و تربیت بھی انہی کے آغوش میں ہوئی اور انہی کے زیر نگرانی میں نے سلوک کی منازل بھی عملاً طے کیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مجھے نسبتاً چھوٹی عمر ہی میں ان دونوں میدانوں میں بہرۂ وافر حاصل ہو گیا۔ بٹالہ ویسے بھی ایک مذہبی شہر تھا' اس لئے (اس دور کی عام فضا کے مطابق) وہاں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے علاوہ آریوں' عیسائیوں اور قادیانیوں سے اکثر مناظرے رہا کرتے تھے۔ اس طرح مجھے فرقوں اور مذہبوں کے تقابلی مطالعہ کا بھی موقعہ مل گیا۔ بعد میں مختلف فرقوں کے باہمی مباحثوں یا آریوں اور عیسائیوں کے ساتھ مناظروں کا دور تو ختم ہو گیا لیکن۔ ختم نبوت کے موضوع پر میں مسلسل لکھتا چلا آ رہا ہوں کہ میرے نزدیک انکار ختم نبوت کا فتنہ امت کے لئے بڑا خطرناک ہے۔ چونکہ میں اس مسئلہ پر قرآن خالص کی روشنی میں گفتگو کرتا ہوں' روایات میں نہیں الجھتا' اس لئے فریق مقابل کے پاس میرے دلائل کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ (بہر حال میں اپنے ذہنی ارتقاء کی سرگزشت بیان کر رہا تھا) میں نے طبیعت کچھ ایسی پائی تھی کہ جب تک کسی معاملہ میں ذاتی طور پر مطمئن نہیں ہو جاتا تھا' وہ دل کی گہرائیوں میں نہیں اترتی تھی' چنانچہ جب ذرا بڑا ہوا اور اسی افتادِ طبیعت کے تقاضے سے اپنے طے شدہ راستے پر تنقیدی نگاہ ڈالی تو شکوک و شبہات ابھر ابھر کر سامنے آتے چلے گئے۔ یہ دور میرے لئے بڑا کرب و اذیت کا تھا۔ جس (موہوم) ''جنت'' میں اس وقت تک مطمئن چلا آ رہا تھا' وہ چھنتی جا رہی تھی اور اس کی جگہ اطمینان اور سکون کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ میرے ایمان کی کشتی ریب و تشکیک کے ان طوفانوں میں ڈوب جاتی اگر ایک محکم لنگر اس کا سہارا نہ بنتا۔ یہ لنگر تھا۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس و اعظم سے میری والہانہ عقیدت۔ روایات و تفاسیر کی رو سے جو قرآن سامنے آتا تھا اس کے متعلق ذہن یہاں تک پہنچ جاتا تھا کہ یہ خدا کا کلام تو ایک طرف کسی بلند انسانی فکر کی تخلیق بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس وقت یہ خیال میرا دامن تھام لیتا تھا کہ جب اس قدر بلند اور پاکیزہ سیرت کی حامل ہستی ﷺ یہ کہہ رہی ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے' اس میں اور تو اور خود میری فکر کا بھی کوئی دخل نہیں تو اس باب میں مجھے کسی آخری نتیجہ تک پہنچنے میں عجلت سے کام نہیں لینا چاہئے۔ اس مقام پر فکرِ اقبالؒ نے میری راہنمائی کی اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جس چیز کو وہ اسلام کے خلاف ''عجمی سازش'' قرار دیتے ہیں' مجھے اس کا سراغ لگانا چاہئے۔ چنانچہ میں

نے کئی برس اس تحقیق میں گزارے کہ جن عناصر کے مجموعہ کا نام مروجہ اسلام ہے' ان کا سرچشمہ کیا ہے اور وہ کس طرح اسلام کا جزو بن گئے ہیں۔ للہ الحمد کہ میری یہ خارہ شگافی بامراد ثابت ہوئی اور میں نے علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لیا کہ ہمارا مروجہ اسلام حقیقی اسلام نہیں۔ یہ میری منزل کا حصہ اولا تھا۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر یہ اسلام نہیں تو پھر اسلام ہے کیا؟ اس سوال کا جواب بھی مجھے پھر اقبالؔ ہی کے ہاں سے ملا کہ اسلام کا سرچشمہ قرآن ہے اور قرآن کے سمجھنے کا طریقہ (انہی کے الفاظ میں) ''محاورۂ عرب اور تصریف آیات'' ہے۔ چنانچہ میں نے اس طریق سے قرآن کریم کے سمجھنے کی کوشش کی تو سب سے پہلے اس کے الفاظ کا مفہوم اسی نہج سے متعین کیا جو میری ''لغات القرآن'' کے اندر محفوظ ہے۔ پھر تصریف آیات کا سوال سامنے آیا۔ تصریفِ آیات سے مفہوم یہ ہے کہ کسی ایک موضوع کے متعلق قرآن کریم میں جو کچھ آیا ہے' اسے یکجا اپنے سامنے رکھا جائے اور پھر ان آیات کے الفاظ کے صحیح مفہوم اور سیاق وسباق کے مطابق یہ دیکھا جائے کہ قرآن اس موضوع کے متعلق کیا راہنمائی دیتا ہے۔ قرآن ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے اور میں گذشتہ قریب تیس سال سے مسلسل اور متواتر اپنا وقت اور توانائی اسی میں صرف کر رہا ہوں اور اب علیٰ وجہ البصیرت' پورے حتم ویقین کے ساتھ پکار کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب عظیم بلاشک وشبہ خدا کا کلام ہے اور پوری نوع انسان کے لئے مکمل اور غیر متبدل ضابطۂ حیات۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو میں گویا ایک ایسا نو مسلم ہوں جو علیٰ وجہ البصیرت ایمان لایا ہو۔

قرآن کریم اور اس کی روشنی میں حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کے خصائص کبریٰ کو سمجھ لینے کے بعد مجھ پر یہ فریضہ عائد ہوا کہ۔۔ دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دوں۔۔ میری تمام تصانیف' جن میں لغات کے علاوہ' پورے کے پورے قرآن کا مفہوم' اور معراج انسانیت بھی شامل ہے۔ نیز میرے مضامین' میری تقریریں' میرا درس قرآن سب اسی فریضہ کی ادائیگی کے عملی مظاہر ہیں۔ میرا سر نیاز بدرگاہ رب العزت قدم قدم پر سجدہ ریز ہے کہ اس نے میری اس سعی ناتمام کو شرف قبولیت سے نوازا ہے اور چونکہ میرا اولین مخاطب طبقہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ہے' اس لئے اس کا ایک کثیر گروہ اسلام کا گرویدہ ہو رہا ہے۔

یہ ہے میری زندگی اور یہ ہے میرے ذہنی ارتقاء کی سمٹی ہوئی تفصیل۔ میں نے نہ کوئی سیاسی پارٹی بنائی ہے نہ ہی کسی مذہبی فرقہ کی بنیاد ڈالی ہے کہ فرقہ بندی قرآن کی رو سے شرک ہے۔ میں علیٰ حد وسعت ارکان اسلام کی تعمیل دوسرے مسلمانوں کی طرح ہی کرتا ہوں اور بار بار اس کا اعلان کرتا ہوں کہ کسی فرد کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرے یا کوئی نیا طریقہ ایجاد کرے۔ میں عملی سیاسیات میں بھی حصہ نہیں لیتا۔ قوم کے سامنے جو سوال آتا ہے' قرآن کریم اور سیرت طیبہ کی روشنی میں اس کا جائزہ لیتا ہوں اور جو کچھ مجھے وہاں سے ملتا ہے اسے بلاکم وکاست اور بلا لحاظ لومۃ لائم قوم کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ میں نہ اپنی فکر کے نتیجے کو سہو وخطا سے منزہ سمجھتا ہوں' نہ اس پر اصرار کرتا ہوں کہ اسے ضرور قبول یا اختیار کیا جائے۔ میری زندگی کا مشن قرآنی فکر کا عام کرنا ہے۔ دعا ہے کہ زندگی کا جو حصہ ابھی باقی ہے' وہ بھی اسی نہج پر گزر جائے۔

والسلام

آصف جلیل، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ (10:57)

قرآن کریم ایک ہدایت کی کتاب ہے۔ یہ انسانوں کے لئے ایک عالمگیر نظام دیتی ہے۔ جسے انسانوں نے اپنی مرضی سے قائم کرنا ہے۔ اگر نہیں چاہیں گے تو کبھی بھی نافذ نہیں ہوگا۔ یہ تو اجتماعی نظام کی بات ہے اس کے علاوہ اس میں بے شمار وہ باتیں ہیں جنہیں ایک فرد اپنا کر اپنی زندگی کو خوشگوار بنا سکتا ہے اور باطل نظام کے برے اثرات سے خود کو بچا سکتا ہے۔

انسانی سوچ اس میں بہت بڑا کردار ادا کرتی ہے۔ جس قدر انسان اپنی سوچ کو قرآن مجید کی ہدایت سے ہم آہنگ کرتا جاتا ہے، اتنا ہی اس کی شخصیت میں نکھار آ جاتا ہے۔ جس کا فائدہ نہ صرف اس کی طبعی زندگی میں ہوتا ہے، بلکہ اس کی اخروی زندگی کے لئے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے اور دوسرے انسانوں کے ساتھ اس کے تعلقات بہت بہتر ہو جاتے ہیں۔

اگر دو افراد قرآنی اقدار پر عمل پیرا ہوں تو ان کے درمیان ایک بہت گہرا رشتہ قائم ہو جاتا ہے جو خونی رشتوں سے بھی بہت بلند ہوتا ہے۔ اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَۃٌ (49:10) مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ فَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِہٖۤ اِخۡوَانًا ۚ۔ اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے۔ (3:103) لیکن اگر کسی کے دل میں حسد، کینہ، بغض وغیرہ کے جذبات ہیں تو یہ واضح ہے کہ یا تو اس نے قرآن مجید کو سمجھا نہیں یا سمجھنے کے باوجود اس کا عمل اس کے مطابق نہیں ہے۔

اگر قرآنی اقدار کو نہ اپنایا جائے تو انسان منفی جذبات کو غیر محسوس طور پر اپناتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ اس کی ذات کا جزو لاینفک بن جاتے ہیں۔ اور وہ نفسیاتی طور پر غیر صحتمندانہ رویوں کو اپنا لیتا ہے کہ اسے یہ سب کچھ غلط نہیں لگتا۔

نفسیاتی امراض میں سے ایک کا ذکر میں تفصیل سے کرنا چاہوں گا جسے Egoism / Egotism کہا جاتا ہے۔

ایگوسٹ (egoist) سے مراد ایسا شخص ہے جس کی توجہ غیر معمولی حد تک اپنی ذات پر مرکوز ہو، خصوصاً اپنی اہمیت، صلاحیتوں، کامیابیوں، رائے، حیثیت یا ضروریات پر۔ نفسیاتی اعتبار سے ایگوازم صرف خود اعتمادی یا اپنے آپ پر اعتماد کا نام نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی اپنی ذات کا تصور اس کی نفسیات میں غیر معمولی اہمیت اختیار کر لیتا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات دوسروں کے احساسات، نقطۂ نظر اور ضروریات نظر انداز ہونے لگتے ہیں۔

یہ فرق سمجھنا ضروری ہے کہ صحت مند خود اعتمادی یہ ہے کہ مجھ میں صلاحیتیں ہیں، لیکن میری کچھ حدود بھی ہیں اور میں

دوسروں سے سیکھ سکتا ہوں۔ اس کے برعکس ایگوازم میں یہ کہا جاتا ہے کہ ”میری صلاحیتیں، میری رائے اور میری کامیابیاں مجھے دوسروں سے زیادہ اہم بناتی ہیں۔“ صحت مند خوداحترامی: ”میری قدر ہے اور دوسرے لوگوں کی بھی قدر ہے۔“
ایگوازم: ”میری قدر اس بات پر منحصر ہے کہ لوگ مجھے کتنا اہم، قابل یا برتر سمجھتے ہیں۔“

ایگوازم ایک مسلسل کیفیت کے بجائے ایک درجے (Spectrum) کی صورت میں بھی پایا جاسکتا ہے۔ ہر شخص کبھی کبھار ایگوسٹک رویہ اختیار کرسکتا ہے، لیکن اگر یہ رویہ مستقل، سخت اور انتہائی نوعیت اختیار کرلے تو یہ شخصیت کے دیگر نفسیاتی مسائل سے وابستہ ہوسکتا ہے۔ تاہم ”ایگواسٹ“ بذاتِ خود کوئی باقاعدہ نفسیاتی تشخیص (Psychiatric Diagnosis) نہیں ہے۔

1۔ نفسیاتی طور پر ایگوازم میں کیا ہوتا ہے؟

ایگوازم کے مرکز میں اپنی ذات پر ضرورت سے زیادہ توجہ ہوتی ہے۔ ایسے شخص کے ذہن میں بار بار یہ سوالات پیدا ہو سکتے ہیں: ”لوگ مجھے کس نظر سے دیکھ رہے ہیں؟“ ”کیا لوگ میری عزت کررہے ہیں؟“ ”کیا مجھے وہ مقام اور اعتراف مل رہا ہے جس کا میں مستحق ہوں؟“ ”میری رائے کیوں قبول نہیں کی گئی؟“ یا ”کسی اور کو مجھ سے زیادہ اہمیت یا کریڈٹ کیوں ملا؟“

اس طرح انسان کی جذباتی کیفیت اس کی خودساختہ شخصیت کی تصویر (self-image) کی حفاظت سے وابستہ ہوجاتی ہے۔

مثلاً فرض کریں کسی کمیٹی نے کسی شخص کی تجویز کے برخلاف فیصلہ کیا۔ ایک نفسیاتی طور پر متوازن شخص سوچ سکتا ہے: ”میری تجویز قبول نہیں ہوئی۔ شاید دوسرے لوگوں نے کوئی ایسی بات دیکھی ہو جو میری نظر سے رہ گئی۔“ لیکن ایک ایگوسٹک شخص یہ سوچ سکتا ہے: ”انہوں نے میری تجویز اس لیے مسترد کی کیونکہ وہ میری صلاحیت کو سمجھتے ہی نہیں۔“ دوسرے ردِعمل میں انسان اپنی انا کو محفوظ رکھنے کے لیے مسئلے کی وجہ اپنے بجائے دوسروں میں تلاش کرتا ہے۔

2۔ ایگوازم کی عام نفسیاتی علامات

الف۔ تعریف اور اعتراف کی ضرورت: ایگوسٹک شخص کو تعریف، پذیرائی، عہدے، اختیار، اثر ورسوخ یا دوسروں کی طرف سے اپنی اہمیت تسلیم کیے جانے کی شدید خواہش ہوسکتی ہے۔ اگر اسے پذیرائی ملے تو وہ عارضی طور پر مطمئن ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر اسے وہ پذیرائی نہ ملے تو اس کے اندر: ناراضگی، مایوسی، حسد، غصہ، تحقیر محسوس ہونے کا احساس اور لوگوں سے دوری پیدا ہوسکتی ہے۔ اس طرح اس کی جذباتی کیفیت بیرونی تصدیق اور تعریف (External Validation) پر منحصر ہوجاتی ہے۔

ب۔ تنقید برداشت کرنے میں دشواری: ایگوازم کی ایک نمایاں علامت تنقید کو غیر جانب داری سے قبول نہ کر پانا ہے۔ اس کے بجائے کہ انسان سوچے: ”کیا اس تنقید میں کوئی درست بات بھی ہے؟“ وہ فوراً یہ سمجھ سکتا ہے: یہ مجھ پر حملہ ہے۔ اس کیفیت کو نفسیات میں انا کا دفاع (ego defensiveness) کہا جاسکتا ہے۔ تنقید انسان کے اپنے بارے

میں قائم تصور کو خطرے میں ڈالتی ہے، اس لیے ذہن فوراً اپنے دفاع میں آ جاتا ہے۔

ج۔ اپنی غلطی تسلیم کرنے میں دشواری: ایگوسٹک شخص کے لیے یہ کہنا مشکل ہو سکتا ہے کہ ''میں غلط تھا۔'' اس کے بجائے وہ اپنے فیصلے کا جواز پیش کر سکتا ہے، حالات کو ذمہ دار ٹھہرا سکتا ہے، دوسروں کو قصوروار قرار دے سکتا ہے، غلطی کو معمولی بنا کر پیش کر سکتا ہے، موضوع بدل سکتا ہے، معمولی جزئیات پر بحث شروع کر سکتا ہے، کہہ سکتا ہے کہ دوسروں نے اسے غلط سمجھا ہے۔ اس صورت میں مقصد حقیقت معلوم کرنا نہیں بلکہ اپنی خود ساختہ شخصیت اور وقار کا دفاع کرنا بن جاتا ہے۔

د۔ ہر حال میں درست ثابت ہونے کی خواہش: بعض ایگوسٹک لوگوں کے لیے اختلافِ رائے ایک مقابلہ بن جاتا ہے۔ سوال یہ نہیں رہتا ''درست بات کیا ہے؟'' بلکہ سوال یہ بن جاتا ہے کہ ''بحث میں جیتے گا کون؟'' یہ ایک بہت اہم فرق ہے۔ حقیقت پسند شخص مضبوط دلیل سامنے آنے پر اپنی رائے تبدیل کر سکتا ہے۔ لیکن انا پر مبنی شخص صرف اس لیے اپنی رائے پر قائم رہ سکتا ہے کہ موقف تبدیل کرنا اسے شکست تسلیم کرنے کے مترادف محسوس ہوتا ہے۔

ہ۔ دوسروں کی بات سننے میں دشواری: ایگوسٹک شخص بعض اوقات دوسروں کی بات سمجھنے کے لیے نہیں بلکہ اپنا جواب تیار کرنے کے لیے سنتا ہے۔ اس لیے وہ بار بار دوسروں کی بات کاٹ سکتا ہے، گفتگو کو دوبارہ اپنی ذات کی طرف لے آتا ہے، دوسروں کے تجربات کو کم اہم سمجھ سکتا ہے، گفتگو پر مکمل غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کر سکتا ہے، دوسرے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں کم دلچسپی دکھا سکتا ہے۔ اس رویے سے رفتہ رفتہ تعلقات متاثر ہوتے ہیں۔

و۔ برتری کا احساس اور مسلسل موازنہ: ایگوازم میں انسان مسلسل دوسروں سے اپنا موازنہ کر سکتا ہے اس طرح کہ ''زیادہ کامیاب کون ہے؟''، ''زیادہ بااثر کون ہے؟''، ''زیادہ علم کس کے پاس ہے؟''، ''زیادہ عزت کا مستحق کون ہے؟'' ایسا شخص دوسروں کو اپنے سے کمتر دیکھ کر خود کو ذہنی طور پر برتر محسوس کر سکتا ہے۔ لیکن اس میں ایک خطرناک انحصار پیدا ہو جاتا ہے، اس کی خود اعتمادی دوسروں سے اپنے موازنے پر منحصر ہو جاتی ہے۔

3۔ بعض اوقات ایگوازم کے پیچھے عدمِ تحفظ بھی ہو سکتا ہے:

یہ ایک اہم نفسیاتی نکتہ ہے۔ ہر ایگوسٹک شخص لازماً اندر سے غیر محفوظ یا کم اعتماد نہیں ہوتا، اس لیے ایگوازم کو ہمیشہ اندرونی کم اعتمادی کا نتیجہ قرار دینا درست نہیں۔ تاہم بعض لوگوں میں حد سے بڑھی ہوئی خود اہمیتی اندرونی عدمِ تحفظ سے دفاع کا ایک طریقہ بن سکتی ہے۔

مثلاً کسی شخص کے اندر یہ خوف ہو سکتا ہے: ''شاید میں اتنا قابل نہیں ہوں۔'' اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے وہ اس کے برعکس یہ تصور قائم کر لیتا ہے: ''میں سب سے بہتر ہوں۔'' ظاہری طور پر یہ انتہائی خود اعتمادی نظر آتی ہے، لیکن بعض صورتوں میں اس کے پیچھے ایک نازک اور غیر مستحکم ''ذاتی تصور'' موجود ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض بظاہر بہت پر اعتماد لوگ معمولی تنقید پر بھی غیر معمولی طور پر شدید ردِعمل ظاہر کر سکتے ہیں۔

4۔ ''نازک انا'' کا چکر

ایک عام نفسیاتی سلسلہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ: تعریف کی خواہش ۔۔۔ تعریف ملنا، وقتی اطمینان ۔ تنقید یا اختلاف اپنی شخصیت کو خطرہ محسوس ہونا، دفاعی رویہ، الزام یا غصہ، تنازع، خود کو دوبارہ ثابت کرنے کی ضرورت اس طرح انسان مسلسل اپنی ذات اور اپنی اہمیت کا دفاع کرنے کے چکر میں پھنس سکتا ہے۔

5۔ فرد پر ایگوازم کے منفی اثرات

1۔ ذاتی ترقی کی رفتار کم ہو جاتی ہے جبکہ سیکھنے کے لیے انسان میں یہ کہنے کی صلاحیت ہونی چاہیے کہ ''مجھے معلوم نہیں ۔'' اور یہ کہ ''مجھ سے غلطی ہوئی ۔'' اگر انا انسان کو یہ دونوں باتیں تسلیم کرنے سے روک دے تو سیکھنے اور اصلاح کی صلاحیت متاثر ہوتی ہے۔ ایسا شخص بہت سا علم رکھتا ہو، ہوسکتا ہے، لیکن اپنی اصلاح کرنے کی صلاحیت محدود ہوسکتی ہے۔

2۔ غلط فیصلوں کا امکان بڑھ جاتا ہے: انا انسان کی غیر جانب دارانہ سوچ کو متاثر کرسکتی ہے۔ کوئی شخص صرف اس لیے مفید مشورہ مسترد کرسکتا ہے کہ مشورہ دینے والا اسے اپنے سے کم اہم سمجھتا ہے۔ اسی طرح وہ کسی ناکام منصوبے کو صرف اس لیے جاری رکھ سکتا ہے کہ ناکامی تسلیم کرنے سے اس کی عزت یا ''ذاتی تصور'' متاثر ہوگا۔ یوں انا کا تحفظ مسئلے کے حل سے زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔

3۔ جذباتی عدمِ استحکام

جب تعریف اور عزت انسان کے لیے غیر معمولی اہمیت اختیار کر جائیں تو عام واقعات بھی غیر معمولی جذباتی ردِعمل پیدا کرسکتے ہیں۔

مثلاً: تعریف ← حد سے زیادہ خوشی، تنقید ← غصہ، اختلاف ← دشمنی، نظرانداز کیا جانا ← ناراضگی، کسی دوسرے کی کامیابی پر حسد، اختیار یا عہدہ ختم ہونے پر شدید پریشانی۔

4۔ ہمدردی میں کمی

ضرورت سے زیادہ اپنی ذات پر توجہ رکھنے سے دوسروں کو سمجھنے کے لیے ذہنی گنجائش کم ہوسکتی ہے۔ ایسا شخص یہ سوال کم کرسکتا ہے:

''دوسرا شخص کیا محسوس کر رہا ہے؟ اس کی توجہ زیادہ تر اس سوال پر رہتی ہے: ''اس معاملے سے مجھ پر کیا اثر پڑ رہا ہے؟''

5۔ تنہائی

ستم ظریفی یہ ہے کہ جو شخص مسلسل اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ بالآخر حقیقی دوستوں اور ساتھیوں سے محروم ہوسکتا ہے۔

لوگ اس سے اس لیے دور ہونے لگتے ہیں کہ اس کے ساتھ تعلق مسابقتی، تھکا دینے والا، تحقیر آمیز، یک طرفہ یا غیر

متوقع محسوس ہونے لگتا ہے۔ پھر وہ شخص یہ نتیجہ نکال سکتا ہے: ''کوئی میری قدر نہیں کرتا۔'' حالانکہ اسے یہ دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے اپنے رویے نے بھی اس تنہائی میں کیا کردار ادا کیا ہے۔

6۔ تعلقات پر ایگوازم کے منفی اثرات

ایگوازم قریبی تعلقات کے لیے خاص طور پر نقصان دہ ہو سکتا ہے۔

خاندان: ایک ایگوسٹک والد یا والدہ یہ رویہ اختیار کر سکتے ہیں: ''میں والد/ والدہ ہوں، اس لیے ہمیشہ میری ہی بات درست ہے۔''

اس کے نتیجے میں بچے رفتہ رفتہ اپنی رائے کا اظہار کرنا چھوڑ سکتے ہیں۔

ازدواجی زندگی: ایک شریکِ حیات بار بار باہمی سمجھ بوجھ پیدا کرنے کے بجائے اپنا درست ہونا ثابت کرنے کو ترجیح دے سکتا ہے۔ اس سے دل میں ناراضی اور رنجش پیدا ہو سکتی ہے۔

دوستی: دوستی باہمی تعلق کا نام ہے۔ اگر ایک شخص مسلسل اپنی بات، اپنی کامیابی اور اپنی اہمیت کے گرد گفتگو رکھے یا دوستوں سے مقابلہ کرتا رہے تو جذباتی قربت کم ہونے لگتی ہے۔

کام کی جگہ: ایگوسٹک رہنما کامیابی کا کریڈٹ خود لے سکتا ہے لیکن ناکامی کا الزام دوسروں پر ڈال سکتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اعتماد اور باہمی تعاون متاثر ہو سکتے ہیں۔

7۔ قیادت اور ایگوازم

جب کسی ایگوسٹک شخص کے پاس اختیار اور طاقت بھی آ جائے تو اس کے منفی اثرات زیادہ نمایاں ہو سکتے ہیں۔ ایسا رہنما: اختلافِ رائے کی حوصلہ شکنی کر سکتا ہے، صرف ہاں میں ہاں ملانے والے لوگوں کو اپنے گرد جمع کر سکتا ہے، تعمیری تنقید مسترد کر سکتا ہے، اجتماعی کامیابی کا کریڈٹ خود لے سکتا ہے، سوال اٹھانے کو بے وفائی سمجھ سکتا ہے، اپنے فیصلوں کو چیلنج کرنے والوں کو سزا یا نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اس سے ایک ''Echo Chamber'' پیدا ہو سکتا ہے، یعنی ایسا ماحول جہاں رہنما کو صرف وہی باتیں سنائی دیتی ہیں جو وہ سننا چاہتا ہے، نہ کہ وہ باتیں جو اسے سننے کی ضرورت ہے۔ یہ کسی بھی ادارے، تنظیم یا سماجی نظم کے لیے خطرناک صورتِ حال ہو سکتی ہے۔

8۔ ایگوازم اور نتائج کی ذمہ داری قبول نہ کرنا

ایک انتہائی نقصان دہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان یہ سمجھنے لگے: ''اگر کچھ غلط ہوا ہے تو اس کا ذمہ دار کوئی دوسرا شخص ضرور ہوگا۔ یا کسی نے ضرور سازش کی ہوگی۔'' اس سے ذمہ داری دوسروں پر منتقل کرنے (externalization of blame) کا مستقل رویہ پیدا ہو سکتا ہے۔ مثلاً:

ناکامی؟: دوسروں کو الزام، انا کا تحفظ، کوئی سبق حاصل نہ کرنا، دوبارہ وہی غلطی۔ جبکہ صحت مند نفسیاتی رویہ یہ ہے:

ناکامی؟: اپنے کردار کا جائزہ، ذمہ داری قبول کرنا، سبق حاصل کرنا، اصلاح۔ دوسرا طریقہ انسان کی ذہنی اور اخلاقی پختگی میں اضافہ کرتا ہے۔

9۔سب سے گہرا نقصان: انا حقیقت سے زیادہ اہم ہو جائے

شاید ایگوازم کا سب سے اہم نفسیاتی نقصان یہ ہے: جب اپنی خود ساختہ تصویر اور اپنی برتری کا تحفظ حقیقت کو جاننے سے زیادہ اہم ہو جائے تو انسان کی فکری اور اخلاقی ترقی رک سکتی ہے۔ انسان کے سامنے پھر دو راستے ہوتے ہیں: ''مجھے ہر حال میں درست ثابت ہونا ہے۔'' مجھے معلوم کرنا ہے کہ حقیقت میں درست کیا ہے۔'' یہ فرق انسانی تعلقات، قیادت، علم، خاندان اور ذاتی کردار، سب پر گہرا اثر ڈال سکتا ہے۔

10۔ایگوازم کو کیسے کم کیا جا سکتا ہے؟

نفسیاتی طور پر درج ذیل عادات مددگار ہو سکتی ہیں:

1۔اپنی غلطی تسلیم کرنے کی مشق کریں۔۔۔۔خاص طور پر چھوٹی غلطیوں سے آغاز کریں۔

2۔جان بوجھ کر دوسروں سے تنقید طلب کریں۔

3۔جواب تیار کرنے کے بجائے سمجھنے کے لیے سنیں۔

4۔اختلافِ رائے کو بے عزتی نہ سمجھیں۔

5۔دوسروں کو حقیقی کریڈٹ دیں۔

6۔خود سے پوچھیں: ''ممکن ہے کہ میری نظر سے کیا چیز رہ گئی ہو؟''

7۔اپنے دفاعی ردِعمل کو پہچانیں۔

8۔ہر اختلاف کو مقابلہ سمجھنا چھوڑ دیں۔

9۔اپنی قدر کو دوسروں سے برتر ہونے کے بجائے اپنی ترقی سے وابستہ کریں۔

10۔ہمدردی پیدا کریں اور شعوری طور پر دوسرے شخص کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

روزانہ اپنے آپ سے یہ سوال کرنا بہت مفید ہو سکتا ہے:

''کیا میں حقیقت دریافت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، یا صرف خود کو درست ثابت کرنے کی؟'' یہ ایک سوال انسان کے اندر موجود بہت سے انا پر مبنی رویوں کو سامنے لا سکتا ہے۔

قرآن مجید میں اس طرح کے رویوں کو فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ (2:10) (دلوں کے روگ) کہہ کر بیان کیا گیا ہے۔ مختلف مقامات پر ان کا ذکر آیا ہے۔ یہاں ان کو کافی حد تک یکجا کر دیا گیا ہے۔ انہی کو آج کی اصطلاح میں نفسیاتی بیماریاں کہا جاتا ہے۔ اور ان کا علاج قرآن پر عمل پیرا ہونا ہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ (10:57)۔ یعنی 'قلبی اضطراب کا علاج' کہا ہے۔ ہم سب کو قرآن کریم کی روشنی میں ہر وقت اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ کہیں یہ رویے ہماری ذات پر اثر انداز تو نہیں ہو رہے اور دوسروں کے منفی رویوں سے بھی خود کو بچایا جا سکے۔

❀❀❀

ڈاکٹر علی نصیر عباسی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تشکیل معاشرہ اور قرآنی کردار

جدید سائنس کے انکشافات

یہ سنہ 2002ء اور مارچ کی 31 تاریخ ہے' 23 مارچ کی یاد میں لگتا ہے کہ ہم سب یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ آپ سب کو مبارک باد ہو اور آپ سب پر سلام ورحمت ہو کہ ایک اچھے مقصد کے لئے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں ورنہ بقول علامہ اسلم جیراجپوری مسلمانوں کا اجماع واتحاد (موجودہ تاریخ) میں اکثر باطل پر ہی ہوا ہے۔ اس تقریب سعید پر میں تمام احباب' جو یہاں موجود ہیں اور انتظامیہ بزم طلوع اسلام کراچی صدر کی خدمت میں بھی دلی ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔ جناب محترم اقبال صاحب اور ان کی ٹیم قابل تعریف ہیں کہ یہ کام محنت طلب ہیں اور ان میں کافی ٹائم اور دوسرے Resources بھی لگتے ہیں۔ اس قسم کے اجتماعات میں مجھے سائنسی تحقیق آپ کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملتا ہے تاکہ آپ کی زندگیاں سنور جائیں اور یہ ثابت ہو کہ ''قرآن حق ہے اور باقی سب افسانے یا وہم وگمان وقیاس''۔ ارشاد قرآنی ہے کہ ''ہم انہیں انفس و آفاق میں نشانیاں دکھاتے جائیں گے تاآنکہ یہ بات ابھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن فی الواقع حقیقت ثابتہ ہے۔'' (41:53) میرا طریقۂ کار یہی رہا ہے اور اس آیت میں میرا شعبہ یا موضوع ''عالم انفس'' یعنی نفس انسانی کے معاملات ہیں یعنی Psychology اور Psychiatry وغیرہ۔ ڈاکٹر سید عبدالودود ''عالم آفاق'' سے بحث کرتے تھے۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت دے۔ ایسے انسان اور عالم شاید ہی مسلمانوں میں پیدا ہوں۔ آج کی اس بامقصد محفل میں ایسے ہی معاملات سیکھیں گے۔ تاکہ ہمارے دل ودماغ بدل جائیں اور ہماری زندگی اعلیٰ بن سکے۔ اگر ہماری محفلیں بے مقصد ہیں' یعنی ہم ان میں کچھ اعلیٰ وارفع نہیں سیکھتے ہیں تاکہ عملی زندگی بہتر ہو تو ایسی محفلوں کا منعقد کرنا وقت کا اور زندگی کا زیاں اور محض فرار زندگی یعنی Escapism کی قسم ہے۔ اس لئے آپ سے تھوڑی سی محنت چاہوں گا۔ یعنی آپ کو تھوڑی Effort کوشش کر کے گہری توجہ قائم رکھنی ہوگی۔ قرآن حکیم اور علم نفسیات کا قانون مسلمہ ہے کہ ''بغیر محنت وجدوجہد کے کچھ بھی

> میری اپیل آپ کی ''عقل'' یا ''Reasoning Faculty'' سے ہے جذبات سے نہیں۔ آپ میں اگر منفی ردعمل پیدا ہو' تو ''علم'' حاصل کرنے اور سیکھنے کے ردعمل کو بیدار کرنے کی کوشش کریں۔ نا کہ جذباتی ردعمل وغیرہ۔ ورنہ آپ کچھ بھی سیکھ نہیں سکیں گے

حاصل نہیں ہوگا''۔ ہمارا موضوع کچھ ایسا ہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک ضروری ہدایت جو نفسیاتی نوعیت کی ہے کہ میرے لیکچر کا تعلق بڑے نازک گوشوں سے ہے' اس میں عین ممکن ہے کہ آپ کے دل و دماغ میں منفی جذبات واحساسات شعوری و لاشعوری طور پر پیدا ہوں۔ تو اس کا ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ وہ آپ کا ذاتی ردعمل (Psychosocial Response) ہے۔ میرا مقصد آپ کے جذبات کی توہین نہیں ہے۔ اگر آپ کو یہ محسوس ہو تو یہ آپ کا ذاتی جذباتی ردعمل ہے۔ آپ کی دل آزاری میرا مقصد نہیں' ہو سکتا ہے میری اپیل آپ کی ''عقل'' یا ''Reasoning Faculty'' سے ہے جذبات سے نہیں۔ آپ میں اگر منفی ردعمل پیدا ہو' تو ''علم'' حاصل کرنے اور سیکھنے کے ردعمل کو بیدار کرنے کی کوشش کریں۔ نا کہ جذباتی ردعمل وغیرہ۔ ورنہ آپ کچھ بھی سیکھ نہیں سکیں گے۔

قرآن حکیم کا سارا زور ہی کردار پر ہے یعنی "Character Is Destiny"۔ قومی معاملہ ہو یا معاشرتی یا شخصی (Individual/Personal) ہو' یہ ہی قانون ہے۔ یعنی تشکیل کردار یا کیریکٹر سازی کے بغیر انسانی مسائل حل نہیں ہوں گے چاہے آپ کچھ بھی کر لیں۔ کراچی کے Defence میں رہ لیں یا امریکہ چلے جائیں یا چاند پر چلے جائیں کچھ بھی نہیں ہوگا

ہمارا موضوع ہے تشکیل معاشرہ (پاکستان اس میں شامل ہے) کے لئے قرآنی کردار کی تشکیل۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'پاکستانی معاشرہ' کے لئے یا کسی اور معاشرہ کے لئے بھی ''قرآنی کردار'' کی ضرورت؟ لیکن کیوں؟ اس سے کیا فائدہ؟ اور ایسا نہ کرنے سے کیا نقصان ہوگا؟ اس طرح کے زندگی کے اہم ترین مسائل پر تو تحقیق سب سے زیادہ مسلمان ممالک میں ہونی چاہئے تھی۔ بہرحال کس کس بات پر روئیں اور ہمارا تحقیق سے کیا واسطہ؟ مفکر عظیم جناب پرویز صاحب نے ایک بار بڑے دکھ سے اور الم انگیز انداز میں ٹھیک کہا تھا کہ ''پاکستان میں ''علم'' جنس کا سد سمجھا جاتا ہے''۔

میں شروع ہی سے اپنا نکتۂ نظر بتا دینا چاہتا ہوں کہ چاہے وہ پاکستان کی تشکیل ہو یا کسی بھی معاشرہ کی تعمیر و بقا' اس کا دارومدار ''کردار'' یا ''کیریکٹر'' پر ہی ہے اور ہمیشہ یہی قانون رہا ہے اور رہے گا۔ ماضئ قریب میں (1947) آزادئ و تشکیل ملک پاکستان کی وجہ بھی ''کردار'' تھا اور مزید ترقی و بقا بھی ''قرآنی کردار'' کے ذریعے ہی سے ہوگی ورنہ نہیں۔

میں یہی حقیقت جدید سائنس کی تحقیقات سے ثابت کرنا چاہوں گا۔ قرآن حکیم کا سارا زور ہی کردار پر ہے یعنی "Character Is Destiny"۔ قومی معاملہ ہو یا معاشرتی یا شخصی (Individual/Personal) ہو' یہ ہی قانون ہے۔ یعنی تشکیل کردار یا کیریکٹر سازی کے بغیر انسانی مسائل حل نہیں ہوں گے چاہے آپ کچھ بھی کر لیں۔ کراچی کے Defence میں رہ لیں یا امریکہ چلے جائیں یا چاند پر چلے جائیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ آیئے مزید تفصیل سے سمجھیں یعنی سائنس کی بارگاہ میں چلتے ہیں۔

اس علم کو یا Study کو عام طور پر نفسیات میں "Characterology" کہا جاتا ہے۔ یہ اب تو ایک باقاعدہ

شعبۂ علم بن چکا ہے۔ اب اس کے بڑے بڑے ماہرین تحقیق و تجربات سے اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ زندگی کے ہر شعبہ میں خاص طور پر معاشرتی اور تنظیمی معاملات میں تشکیل کردار یعنی لیڈروں کا کردار ''اعلیٰ'' ہونا ضروری ہے۔ ورنہ سب کچھ بے کار ہے۔ ساری کوششیں جو صدیوں سے ہو رہی ہیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔

> جس وقت ہمارے منتخب قومی نمائندے یا نیشنل لیڈر اقتدار ہاتھ میں لے لیتے ہیں تو اسی لمحے ان کے کردار کا بیج قوم کی تقدیر بن جاتا ہے' قوم کی منزل مقصود اسی کردار کے مطابق طے پاتی ہے۔ قوم کی تقدیر لیڈروں کے کردار پر منحصر ہوتی ہے

ابھی' ایک ریسرچر Sheehy نے تشکیل معاشرہ اور کردار سے متعلق 25 سالہ تحقیق کا نام ہی "Character" رکھا ہے۔ جس کی ابتداء ہی کچھ یوں ہے۔ ''اگر آپ عمل کا بیج بوئیں گے تو عادت کا پھل کاٹیں گے۔ پھر اگر عادت کا بیج بوئیں گے تو کردار یعنی کیریکٹر کا پھل کاٹیں گے اور پھر اگر کردار کا بیج بوئیں گے تو ہمیں ہماری منزل مقصود مل جائے گی'' اصل الفاظ یوں ہیں۔

"Sow an act, and you reap a habit, Sow a habit and you reap a character, Sow a character and you reap a destiny."

اس قانون کو سامنے رکھتے ہوئے وہ اپنے نتائج پیش کرتی ہیں جو غور طلب ہیں مفہوم ہے کہ ''اور جیسے ہی' جس وقت ہمارے منتخب قومی نمائندے یا نیشنل لیڈر اقتدار ہاتھ میں لے لیتے ہیں تو اسی لمحے ان کے کردار کا بیج قوم کی تقدیر بن جاتا ہے' قوم کی منزل مقصود اسی کردار کے مطابق طے پاتی ہے۔ قوم کی تقدیر لیڈروں کے کردار پر منحصر ہوتی ہے وغیرہ۔''

"By the time they become national leaders, the candidate's character are sown... the destiny they reap will be our own".

اور آپ حضرات متوجہ ہوں کہ معاملہ غور طلب آ رہا ہے کہ

"Finally, examining how character is formed in our national leaders, is an effective way to learn about our selves."

یہ تو ایسا لگ رہا ہے کہ قرآنی آیت کا ترجمہ ہو کہ' جیسے ہم خود ہوتے ہیں ویسے ہی ہمارے لیڈر ''یا'' جیسے لیڈر ویسی ہی قوم'' .... یہ ہے پیمانہ۔

ان مسائل پر گہری اور Objective Research معروضی تحقیق کرنے والے اب بھی مغرب میں بہت کم ہیں۔ تحقیق تو وہ ہی کرتے ہیں اور ان کا یہ احسان عظیم انسانیت پر ہے۔ بہر حال ان حالات میں بڑے انتظار اور مسلسل تحقیق کے بعد ہی ایسی اعلیٰ درجے کی علمی و عملی تحقیق سامنے آتی ہیں۔ جن عظیم علماء یا مفکرین نے ان معاملات کی گہری اور وسیع ریسرچ کی' ان میں ممفورڈ کا نام بہت اونچا ہے۔ بڑا عظیم عالم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اگر ہم پورے کردار یا ساری شخصیت کو نہیں سنواریں گے تو ہم فیل ہوتے جائیں گے۔ جیسے کہ پچھلے پانچ سو سال کی تاریخ میں ہوا۔ معاشرتی و معاشی و سیاسی لحاظ

سے بیرونی طور پر ہم کچھ بھی کر لیں اگر ہم نے متوازن کردار یا Balanced Personality تعمیر نہیں کی تو ہماری تہذیب تنزل کی طرف گرتی چلی جائے گی جیسا کہ ہمیشہ ہوا ہے' تو ضرورت مکمل نشوونما یافتہ ذات یا کردار انسانی کی ہے۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔''

ڈاکٹر فرام' (Fromm) جنہیں شاید نوبل انعام ملنا چاہئے تھا' لیکن مغرب کی غیر منصفانہ اور سرمایہ دارانہ ذہنیت نے گوارانہ کیا۔ جو ایک عظیم نفسیاتی ماہر و معاشرتی علوم کے بلند ترین عالم ہیں۔ ان کی ساری زندگی اسی پیچیدہ ترین موضوع کی تحقیق میں گزری اور ان کی ہر کتاب تقریباً اسی معاملے کی تفسیر ہے۔ خاص طور پر ان کی کتابیں۔

"To Have or To Be", "The Anatomy of Human Destructiveness", The Sane Society".

بڑی ہی قابل قدر خدمات ہیں نوع انسانی کی۔ وہ ان نتائج پر پہنچا ہے کہ تشکیل معاشرہ کے لئے اعلیٰ کردار ضروری اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر تشکیل معاشرہ ممکن ہی نہیں اور ایسا کرنا تو کیا۔ ایسا سوچنا بھی غلط ہے اس کے برعکس سوچ Abnormal Mind یا Destructive Character کی علامت قرار دی جاتی ہے وغیرہ۔ اس کا کہنا ہے کہ اعلیٰ کردار "Loving یا "Being Mode" Character" یا (Productive-Creative Character) کے بغیر تشکیل معاشرہ ممکن نہیں۔ مثلاً "The Anatomy of Human Destructiveness" میں جو ایک Pioneering Research.... ہے اور آج تک یعنی سنہ 2002ء تک' اس کے پائے کی تحقیق نظر نہیں آتی۔ ساری کتاب میں صاف بتایا گیا ہے کہ برے یا منفی کردار یعنی Destructive Character کے لوگوں یعنی لیڈروں کے آنے سے قوموں کا کیا حال ہوتا ہے؟ اور دنیا کس دردناک عذاب سے دوچار ہوتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کی طرح کے حادثات اور ان سے پیدا ہونے والی تباہیاں اسی کا نتیجہ ہیں مثلاً Hitler (ہٹلر) اور Stalin (سٹالن) وغیرہ کے کردار کا نتیجہ انسانیت اب تک بھگت رہی ہے۔

برے یا منفی کردار یعنی Destructive Character کے لوگوں یعنی لیڈروں کے آنے سے قوموں کا کیا حال ہوتا ہے؟ اور دنیا کس دردناک عذاب سے دوچار ہوتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کی طرح کے حادثات اور ان سے پیدا ہونے والی تباہیاں اسی کا نتیجہ ہیں

لینن (Lenin) کی ساری زندگی کی جدوجہد کا خاتمہ کہاں ہوتا ہے دیکھیے!

لینن کی عظیم جدوجہد سے روس آزاد ہوا اور ایک معاشرتی تجربہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ لینن کردار یعنی کیریکٹر کا قائل نہیں تھا۔ لیکن زندگی کے آخری وقت میں اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو گیا۔ جب کہ (Stalin) سٹالن کو اقتدار دیا جا رہا تھا۔ تو اس نے وصیت کی کہ ایسا نہ کریں۔ لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ روسی قوم نے Stalin کے کیریکٹر یا

کردار کا بیج بویا اور وہ دیکھو! آپ کے سامنے روسی قوم کا نظام تباہ ہوگیا۔ صدیوں کی محنت اور عظیم قربانیاں بے کار ہوگئیں۔ آج اس تجربہ کے نتیجے' عبرت کے لئے باقی ہیں۔ ساری انسانیت کے لئے یہ رک کر سوچنے اور سمجھنے کا مقام ہے کہ اس طرح کے جذباتی فیصلوں کا انجام ایسا ہی ہوگا۔

فرام کی آخری عظیم تحقیق "To Have or To Be" تو نام سے ہی ظاہر ہے۔ اس میں بھی وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اعلیٰ انسانی معاشرہ "Good Society" صرف اور صرف اعلیٰ انسانی کردار کا ہی نتیجہ ہے۔ اور برا یا ''انسانیت کش معاشرہ'' انسانیت کش کردار سے پیدا ہوتا ہے۔ جسے وہ "Having Mode" کہتا ہے۔ "Having Mode" کا تجربہ تو ہمیں ہر پل ہو رہا ہے۔ اس کے تجربے کے لئے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ساری دنیا اسی کردار کے نتائج بھگت رہی ہے۔

1997ء میں ڈاکٹر Bennis نے اپنی ساری زندگی کی تحقیق پیش کی ہے۔ اس کا بین الاقوامی مقام ہے اور لیڈر شپ اور "Organizations" کے بہت بڑے ماہر مانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر بینس کے نتائج بھی غور طلب ہیں نوع انسانی کے لئے۔ سنئے دل کے کانوں سے۔

''ہماری کامیابی و ناکامی کا دارومدار ہر طرح کی تنظیم میں (چھوٹی تنظیم سے قومی تنظیم تک) تنظیموں کی اوپری سطح کے کردار کی نوعیت و معیار (Quality) پر مبنی ہے۔''

"The Success and failure of all organization, rests on the percieved quality at the top."

اور یہ کہ ''ہم لیڈروں کے بغیر چل نہیں سکتے' کوئی کام ہی نہیں کر سکتے ہیں۔ ہماری زندگی کا دارومدار لیڈروں کے کردار کی نوعیت و معیار پر مبنی ہے''۔

"We can not function with out leaders. Our quality of life depends on the quality of our Leaders."

یعنی پھر قرآنی آیات کا مفہوم ہے کہ جیسے ہم ویسے لیڈر یا جیسے ہمارے لیڈر ہوں گے ویسی ہی قوم۔ آگے سنئے یہ سائنس دان کیا کہتا ہے:

''250 ملین امریکیوں کی زندگی کا دارومدار ہی لیڈر شپ پر ہے۔ ہمارا سارا کلچر یا سسٹم بحران زدہ ہے اور یہ بحران بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ امریکہ اپنا راستہ بھول چکا ہے۔ نشے کی لت کے معاملے میں ہم نمبر 1 (ایک) قوم ہیں۔ سارا معاشرہ' تمام تنظیمیں اور ادارے Institutions بحران میں ہیں۔ کیونکہ ہماری لیڈر شپ کا کردار یا کیریکٹر گر چکا ہے۔ یعنی ہمارے امراض کی تشخیص دراصل لیڈر شپ کا بحران ہے۔ جس سے سارے کے سارے مسائل ابھرتے ہیں۔ جب لیڈر شپ کا معیار (Quality) گرے گا مسائل حیات بڑھ جائیں گے۔ جس طرح انسان بغیر دماغ کے کام ہی نہیں کر سکتا

ہے‘اسی طرح سے معاشرہ لیڈروں کے بغیر چل نہیں سکتا ہے اور اس طرح سے تنزل وتباہی جاری رہے گی۔ جب تک لیڈروں کے کردار ٹھیک نہیں کریں گے ہم بحران زدہ اور تباہ ہوتے جائیں گے۔ یعنی پہلا کرنے کا کام اعلیٰ کردار کے لیڈر بنانا ہے اور پھر معاشرتی نظام بلند ہو سکے گا۔“

لیکن سوال یہ ہے کہ لیڈر شپ ہے کیا بلا؟ ڈاکٹر بنیس کا یہ جواب انتہائی غور طلب ہے۔ سنئے! وہ کہتا ہے۔

”لیڈرشپ اعلیٰ کردار کا دوسرا نام ہے۔ (Leadership is Character) یا دوسرے الفاظ میں یہ "Integrated Adult" کو کہتے ہیں۔ (نشوونما یافتہ ذات) اور مزید سمجھا تا ہے کہ ’اس کے معانی ہیں کہ ’بحیثیت انسان ’ہم‘ کیا ہیں؟“

(Who we are as Human Being?) اور لیڈر کی تشکیل کا عملی طریقہ (process) وہی ہے جو اعلیٰ درجہ کا انسان بننے کا طریقہ ہے۔“

ڈاکٹر فرام اپنی عظیم کتاب "The Art of Loving" میں اس امر کی وضاحت کتاب کے آخری باب میں یوں کرتے ہیں کہ ”اگر اعلیٰ کیریکٹر کی خصوصیات عملی طور پر ہماری قوم کی زندگی میں مسلسل ومتواتر منتقل نہیں ہوں گی تو کچھ بھی کر لیں‘ ہماری پانچ ہزار سالہ تہذیب نیست ونابود ہو جائے گی۔“

ابراہیم میسلو (Maslow) کا شمار بھی دنیا کے عظیم مفکرین اور نفسیات کے سائنسدانوں میں ہوتا ہے۔ وہ بھی عبرت انگیز و پر از نصیحت نتائج پر پہنچتا ہے کہ ”اعلیٰ سوسائٹی کے ساتھ اعلیٰ کردار شرط اولین ہے اگر اعلیٰ کردار سازی پر معاشرہ نے توجہ نہیں دی تو ہمارا وجود مٹ جائے گا۔“

آپ نے دیکھا کہ کہاں پہنچ گئے ہیں یہ علماء یا سائنسدان اور مفکر؟ دیکھئے اور غور کیجئے کہ قرآن کی آواز کہاں سے ابھر رہی ہے۔ کیا قرآن حکیم نے سچ نہیں کہا کہ ”ہم انہیں عالم انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے تاکہ یہ بات ابھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن فی الواقع حقیقتِ ثابتہ ہے“۔

پھر عرض کروں گا کہ کوئی بھی کام ہو‘ کوئی بھی انسانی زندگی کا معاملہ ہو اس میں کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر ایک قدم بھی ترقی ممکن نہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں یہی قانون حق ہے۔ موجودہ مسلم ممالک ہوں یا غیر مسلم قومیں‘ اور ہماری تباہی و بربادی و بحران کے معاملے‘ جس کے ہم عین گواہ ہیں ان سب معاملات کی بنیادی وجہ بھی یہی ہے۔ یعنی لیڈر شپ کا معیار اعلیٰ نہیں ہے۔ یعنی قرآنی کردار کی کمی یا نہ ہونا ہے اور یہ بات بھی غور طلب ہے کہ دنیائے علم جدیدہ کے یہ ماہرین جو تفصیل اس کردار کی بتاتے ہیں کہ جس کے بغیر بات بنتی نہیں ہے‘ تو آپ یہ دیکھ کر حیران ہوں گے اور بات ہے بھی باعث رشک کہ وہ قالب یا "Pattern" یا "Design" بھی قرآنی کردار کی (غیر مکمل) سی تفصیل ہوتی ہے۔ جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ مختصراً عرض ہے کہ آج متمدن دنیا اپنی تحقیق سے اس مقام اعلیٰ تک پہنچنے کی کوشش کر

رہی ہے جس کا انکار وہ عملی طور پر صدیوں سے کرتی چلی آئی ہیں۔ نامور مفکر ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری جو مشرق و مغرب کا گہرا تجزیہ و مطالعہ رکھتے ہیں اور اسلامی تہذیب کے بڑے عالم ہیں۔ اپنی تحقیق کو یوں بیان کرتے ہیں کہ دل و دماغ روشن ہو جاتا ہے:

''میرا خیال ہے کہ دنیا کی متمدن قومیں آج وہاں تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ جس مقام پر فاروق اعظمؓ (حضرت عمرؓ) اس زمانے میں پہنچے تھے۔ لیکن یہ متمدن قومیں آج بھی اس مقام تک سخت جدوجہد اور مشکلات کا مقابلہ کیے بغیر نہیں پہنچ سکیں گی۔'' (الفتنۃ الکبریٰ)۔

یورپ اور امریکہ کی تاریخ میں وہ دن سیاہ ترین دن تھا' جب ان کی درسگاہوں سے یہ اعلان کیا گیا کہ قرآن یا اسلام بھی دوسرے مذاہب عالم کی طرح ایک مذہب یعنی محض "Religion" ہے اور مذہب کو تو وہ تیاگ چکے تھے۔ قرآن حکیم کو بھی وہ عین اس مقام پر لے آئے۔ دنیا کے تمام مذاہب تو مغرب کے علماء کے نزدیک افسانے بن کر رہ گئے تھے جو حقائق کا مقابلہ ہی نہیں کر سکتے تھے اور دنیا نے مغرب کے دوسرے مذاہب کے خلاف جو ردِ عمل اختیار کیا' اس کی شدت میں بغیر تحقیق کیے یہ جذباتی فیصلہ عام طور پر نافذ کر دیا جس کے نتائج یہ نکلے کہ وہ قرآنی حقائق کی طرف سے اندھے اور بہرے ہو گئے۔ اس گناہ عظیم کے بعد کس طرح پھر حقائق قرآنی ان کے سامنے آ سکتے تھے۔ مزید یہ کہ ہمارے موجودہ کردار نے بھی تو انہیں روک رکھا ہے کہ ایسے ہوتے ہیں مسلمان جیسے ہم ہیں۔ جس کی وجہ سے ہم دوگنے عذاب میں مبتلا ہیں۔ یہ خدا کا قانون ہے۔

اب ہم آتے ہیں تشکیل پاکستان کی طرف' کہ اس کا کردار سے کوئی تعلق ہے بھی یا نہیں؟ ہم وقت کی کمی اور دوسرے محرکات کی وجہ سے اختصار سے کام لیں گے۔

انیسویں صدی کا آغاز ہو چکا تھا سلطنت مغلیہ آخری ہچکیاں لے رہی تھی اس برصغیر کے مسلمانوں کی داستان زوال' مایوسی اور شکست کے ان مراحل سے گزر رہی تھی جن کا انجام حسرت ناک موت کے سوا اور کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ مسلمانان ہند کے زوال و شکست کی یہ تاریک رات عہد رفتہ میں صدیوں تک پھیلی ہوئی تھی کہ 1857ء کی بغاوت ہند' شدت جذبات کی آخری کڑی ثابت ہوئی۔ یہ جرات مسلمانوں کو بڑی ہی مہنگی پڑی اور انگریزوں نے ہندوؤں کی سرپرستی کی اور یہ دونوں مظلوم و نہتے مسلمانوں کے خلاف ڈٹ گئے۔ آتش انتقام سے محکومی محرومی و مظلومی' غربت و افلاس' بے بسی اور بے چارگی کے بھیانک سائے چاروں اطراف سے مسلمانان ہند کو گھیر چلے تھے۔ مسلمانوں کی زندگی گویا کہ ایک قبرستان سی بن گئی تھی۔ چاروں طرف حسرت و مایوسی اور شکست کی نوحہ خوانیاں بپا تھیں اور نظر آتا تھا کہ یہ قوم اب گری یا اب۔ جیسے کہ موت کا انتظار ہو۔ یہ دم توڑتی ہوئی قوم عالم سکرات میں ایک بار پھر نشاۃ ثانیہ اختیار کر سکے گی' زندہ ہو سکے گی' ممکن ہی نظر نہیں آتا تھا۔ کوئی معجزہ ہی ایسا کر سکتا تھا۔ یہ معجزہ ہوا۔ وہ معماران پاکستان کے کردار Character کا معجزہ تھا۔ ان کے عظیم کیریکٹر نے پھر سے ہمیں دنیا کی آزاد قوموں کی صف میں لا کھڑا کیا۔

تاریخ بتارہی ہے کہ قومی زندگی کے نازک ترین موڑ پر اگر ہمیں ان عظیم وجلیل راہ نماؤں کی قیادت نصیب نہ ہوتی تو آج ہم اغیار کی غلامی اور محکومی میں مزید تباہ و برباد ہورہے ہوتے جیسا کہ پچھلے پچاس سالوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ ہوا ہے اور موجودہ ہندو مسلم فسادات میں جو حالت زار مسلمانوں کی ہے وہ آج آپ کے سامنے ہے۔ ان حالات کی صرف ہلکی سی جھلکیاں آپ کے سامنے آتی ہیں۔ باقی حقائق ظلم وستم کے بارے میں پروپیگنڈا (Propaganda) اور دوسرے طریقوں کی وجہ سے سامنے نہیں آسکتے ہیں۔

ہماری نشاۃِ ثانیہ کی داستان سرسیدؒ سے شروع ہوئی اور اقبالؒ سے ہوتی ہوئی عظیم رہنما جناحؒ پر ختم ہوئی ہے۔ یہ جیت اور تشکیل معاشرہ ان تینوں کے اعلیٰ کردار کی وجہ سے ہوئی۔ مسلمان تو کیا غیر مسلم بھی ان کے کردار کے قائل ہیں۔ میں ان تینوں میں سے صرف آخری کڑی محترم جناح کے کردار کے متعلق بہت مختصر سی بحث کروں گا۔ ویسے تو ان تینوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ تھوڑا سا کہتا چلوں مثلاً علامہ اقبال جو بظاہر ہمیں لگتا ہے کہ بس محض ایک شاعر و فلسفی سے ہی تھے۔ لیکن معاملہ ایسا نہیں ہے۔ ساری زندگی انہوں نے مسلمانان ہند اور انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ ان کے لئے ایک تجزیہ یہ بھی ہے کہ اگر وہ اپنی صلاحیتیں کہیں اور لگاتے' وہ اتنی تھیں کہ ''فورڈ'' وغیرہ سے بھی آگے ہوتے دولت و دنیاوی معاملات میں۔

ہم بات قائد اعظمؒ کی کر رہے تھے۔ سرسید و اقبال کی جدوجہد شاید بے کار چلی جاتیں اگر جناح ان کی کی ہوئی محنت کو ساحل مراد تک نہ پہنچاتے۔ عظیم انسان و مفکر پرویز صاحب سے بڑا گواہ اور کون ہوگا۔ انتہائی مستند گواہ۔ وہ جائزہ لیتے ہیں کہ ''جناح نے پورے دور میں ایک لمحہ کے لئے بھی جذباتی رجحان کی دلفریبیوں کا سہارا نہیں لیا۔ ہندو قوم تعلیم و ترقی اور فکر و شعور کی سنجیدگی میں مسلمانوں سے کس قدر آگے تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں بھی گاندھی جیسی شہرۂ آفاق شخصیت کو اپنی لیڈرشپ کا سکہ جمانے کے لئے مہاتمائی روپ دھارنا پڑا اور وہی انداز اختیار کرنے پڑے جو ہندو کے جذبات کو اپیل کر سکیں۔ لیکن کیا حیرت انگیز ہے سیاسیات ہند کی تصویر کا دوسرا رخ کہ جناح مسلمانوں جیسی جذباتی قوم کی قیادت کے لئے میدان میں آئے اور انہوں نے قومی جذبات پر اثر انداز ہونے کے لئے اس قسم کا کوئی ادنیٰ کھیل کھیلنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

زندگی کے آخری سانس تک انہوں نے اس قسم کی دلفریب نمائشوں سے کلیتہً اجتناب کیا۔ یہی جناح کی عظمت کا وہ امتیازی نشان ہے جسے ہم ان کے کمالات میں سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور یہی تھا ہماری فتح عظیم کا وہ حقیقی راز جو حصول پاکستان کا حقیقی امین قرار پائے گا۔'' اور ''پھر اقبال کے خطاب الہٰ آباد کے ٹھیک دس سال بعد جناح 1940ء میں قراردادِ پاکستان کو لے کر میدان میں آچکے تھے اور یہ جدوجہد 1947ء میں حصول پاکستان پر منتج ہوئی۔'' یہ سات یا دس سالوں کا عرصہ! اور پھر یہ نتائج! تاریخ انسانیت حیران ہے کہ یہ کیسے ہوا؟ مزید یہ کہ ہماری بے سروسامانی بھی تو دیکھئے۔ جائزہ

ہے کہ

''تحریک پاکستان کی مخالفتوں کا ہجوم جن کا مقابلہ قائداعظم تن تنہا کر رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس تحریک کے ہم نوا لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں تھے۔ لیکن ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ فوج کے سپاہیوں کی سی تھی۔ ان کا کمانڈر صرف ایک تھا۔ انہوں نے یہ خطرناک جنگ کس سازو سامان کے ساتھ لڑی اس کا اعلان انہوں نے ایک اجلاس میں ان الفاظ میں کیا تھا۔'' اورنگ زیب روڈ نئی دہلی پر میری نجی قیام گاہ کو شاید رشک کی نگاہوں سے دیکھا جائے۔ مگر یہ تو دیکھئے کہ ہمارا اسیکریٹریٹ کہاں ہے، فوج کہاں ہے، میرا اسلحہ خانہ کس قدر ہے۔۔ ایک اٹیچی کیس۔ ایک ٹائپ رائٹر اور پرسنل اسسٹنٹ۔ بس یہ ہے ہمارا سازو سامان اور اسلحہ اور فوج۔'' مفکر قرآن پرویز صاحب خراج تحسین یوں پیش کرتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ ''اس مرد مجاہد کے کردار کی پاکیزگی اور بلندی ہی تھی جس سے انگریز، ہندو اور خود اسلام کے علمبردار لیڈروں کی پیہم اور متحدہ مخالفتوں کے علی الرغم اس جنگ میں ایسی شاندار کامیابی ہوئی۔'' (طلوع اسلام دسمبر 1984ء)۔

یہ تو تھی محترم پرویز صاحب کی گواہی۔ اب آخر میں لیجئے دشمن کی گواہی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی گواہی سے مستند گواہی اور کس کی ہوگی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل انٹرویو دیا کہ ''مسلمانان ہند کو صرف یہ شخص ہی بام ترقی اور بام عروج پر لے گیا ہے۔

مسٹر ڈینس! میں اب عمر کے آخری دور میں داخل ہو گیا ہوں۔ بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اس عمر میں غلط بات نہیں کروں گا۔ میں نے سچ بات من و عن بیان کر دی ہے۔ تقسیم ہند کے ڈرامے کا واحد کردار فقط میں ہی باقی رہ گیا ہوں۔ تمام سیاسی زندگی میں جس شخص سے سب سے زیادہ متاثر ہوا، وہ مسٹر محمد علی جناح کی ذات و شخصیت تھی۔ میں نے ان میں منافقت کا شائبہ تک نہ دیکھا۔ اتنا بلند کردار انسان اور قومی لیڈر شاید ہی مسلمانوں کو دوبارہ ملے۔'' (جنگ 24 دسمبر 2001ء)۔

اور تازہ ترین جائزوں میں محترمہ شمیم انور نے، ابھی دسمبر 2001ء میں، اس پہلو کا جائزہ بڑی خوبصورتی سے اور اختصار سے یوں لیا ہے جسے کوزہ میں دریا بند کرنا کہا جائے تو صحیح ہوگا۔ وہ کہتی ہیں ''تاریخ ثابت کرتی ہے کہ بہرحال جناح کے مخالفین میں برطانوی تسلط، جن کی حکومت کا سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ یعنی اتنی بڑی سلطنت اور قوت کی حامل حکومت، ہندو قوم جس میں ان کے دولتمند برلا و ٹاٹا بھی شامل تھے اور مسلمانان ہند کی ساری مذہبی پیشوائیت اور تنظیمیں بھی۔ ان سب کا مقابلہ جناح نے کیا۔ ان کے پاس محض اور محض اعلیٰ کردار تھا اور دیکھو کیریکٹر کی جیت ہوئی۔ یہ تمام طاقتیں ہار گئیں۔ کیریکٹر بڑی چیز ہے۔'' تو محترم ساتھیو! یہ ثابت ہوا کہ قرآنی کردار کے بغیر اعلیٰ معاشرہ کی تشکیل یا تشکیل پاکستان یا بقاء وطن ممکن نہیں۔ اللہ پاکستان کو برقرار رکھے۔ لیکن اس کے لئے انسان سازی یا کردار سازی پر توجہ دینی ہوگی۔ اسی طرح سے جیسے قرآن حکیم نے کہا ہے۔

میں نے آپ کے سامنے قرآنی حقائق (Universal Laws) کو ماڈرن سائنسی تحقیق سے سمجھانے کی کوشش

کی ہے کہ شاید یہ قوانین آپ کے ''دماغ'' سے ''دل'' میں اتر پائیں۔ مزید یہ کہ محترم مفکر قرآن پرویز صاحب کے الفاظ میں ''کرنے کا کام'' یہ ہے کہ

''اس اعتبار سے آنے والے تمام زمانوں کے لئے سیرت رسول اللہ ﷺ اور سیرت خلفاء راشدینؓ اسوۂ حسنہ قرار پائی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سیرت و کردار کے حامل مومن قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے۔ بنابریں جو قوم اسلامی نظام قائم کرنے کا عزم لے کر اٹھے اس کے لئے کرنے کا پہلا کام یہ ہوگا کہ قرآنی تعلیم و تربیت سے مومن پیدا کرے' جو نظام کو قائم کر کے چلا سکیں۔ جب یہ مومن پیدا ہو جائیں گے' تو وہ قرآنی حدود و قیود کے اندر رہتے ہوئے دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق اس نظام کا طریق کار بھی متعین کر لیں گے اور اسلامی قوانین بھی مرتب کر لیں گے۔ اس کے سوا اسلامی نظام کے قیام کی کوئی صورت نہیں۔''

موجودہ حالات میں ہم سب نے' اس سلسلے کے ارتقاء کے لئے زمین ہموار کرنی ہے اور بیج بونے ہیں۔ شاید صدیوں تک! پتہ نہیں فصل کون سی خوش نصیب قوم کاٹے گی۔ لیکن یاد رہے کہ جو بھی جدوجہد آپ سب نے قرآن کے مطابق کی تو ''نظام ربوبیت'' قائم ہونے میں آپ کا بھی ہاتھ ہوگا۔ کتنی بڑی سعادت ہوگی یہ اور انسانیت کی یہ بہت بڑی خدمت ہوگی۔ ایسی ہی خدمت سے کردار بنتا ہے اس عملِ پیہم میں ہمیں عام عملی سیاست میں حصہ نہیں لینا۔ نا ہی کوئی ''عوامی'' طریقے اپنانے ہیں۔ غلط ذرائع اور وسائل کا خیال تک دلوں میں نہ لائیے۔

آخر میں یہ عرض کروں گا کہ میں اس موضوع کا نام یہ رکھنا چاہتا تھا۔ ''بزموں کی تشکیل و بقا کے لئے قرآنی کردار کی ضرورت'' کیونکہ باباجی کی وفات کے بعد سے ہی ہماری تحریک کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ ہم مسلسل شدید بحران کا شکار ہیں۔ جو جاری ہے بڑی تیزی سے۔ اس کی تفصیل تو بہت طویل ہے لیکن اگر سمٹا یا جائے تو وجہ اس زوال کی' سبب اس بحران کا بے زری یا وسائل کی کمی نہیں ہے۔ سبب کچھ اور ہے' وہ ہے: ''کردار یا کیریکٹر سازی نہیں ہے'' یعنی زیادہ سے زیادہ شاید ہم اپنی بزموں میں لٹریچر اور درس پھیلا رہے ہیں۔ یہ بہت ضروری ہے اور اس کام کے لئے آپ سب باعث تحسین و آفرین ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم اپنے اندر خوشگوار قرآنی کردار تخلیق نہیں کر رہے ہیں۔ نا ہی کردار سازی پر بزموں میں زور شور ہے۔ نا کوئی پلان ہیں' اپنے خاص تقاضوں کے لحاظ سے۔ مکمل طور پر تو کردار سازی نظام قرآنی میں ہی ممکن ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ عملی طور پر ہم کچھ بھی نا کریں۔ یعنی ہمارا کردار تو روائتی پاکستانی' امریکی' برطانوی یا ہندوستانی وغیرہ رہے اور نتائج کچھ اور ملیں!

اب تو بہت سے لوگ اس عظیم ترین قرآنی لٹریچر سے بھی کچھ بور ہو گئے ہیں کہ ہمارے ہاں سے (Some thing new) کے تقاضے ہوتے ہیں کہ جو کچھ موجود ہے وہ کافی نہیں۔ ہماری بزموں میں دوسرے مصنفین کی "Low quality books" یعنی غیر معیاری کتابیں بھی بیچی جاتی ہیں اور پیش کی جاتی ہیں۔ اور بظاہر وجوہات بہت سی بتائی جاتی ہیں لیکن اصل

وجوہات نظروں سے اوجھل ہیں۔ یہ شعوری و لاشعوری محرکات ہمیں ہڑپ کر جائیں گے۔ قرآنی پیغام پھیلانے کے ساتھ ساتھ' اگر ہم قرآنی کردار اپنے اندر تخلیق کرتے رہے تو ہم باقی رہیں گے ورنہ نہیں۔

نوع انسانی اور متمدن قوموں کا مستقبل صرف اور صرف خالص قرآنی تعلیمات سے وابستہ ہے۔ جو کہ صرف ہمارے پاس ہے اور کہیں بھی نہیں۔ نفسیاتی و معاشرتی علوم میں یہ بار بار ثابت ہو چکا ہے کہ ''محض کتابیں شائع کرنے سے اور اعلیٰ پائے کے مقرروں کے ذریعے پیغام پھیلانے سے معاشرہ میں تبدیلی نہیں آ سکتی ہے۔ وہ فکر جو عمل پیہم سے محروم ہو تو یہ خطرہ ہوتا ہے کہ وہ فکر نیست یا فنا نہ ہو جائے۔'' ڈاکٹر فرام نے اس حقیقت کو یوں بیان کر دیا اور ڈاکٹر گروف Grof جو اس سال 2002ء میں بین الاقوامی سطح کے ماہر نفسیات و سائنسداں ہیں' وہ اس قانون کو یوں سمجھاتے ہیں کہ ''اگر فکر پر عمل نہیں کیا جائے گا تو وہ فکر معدوم ہو جائے گی۔ اس فکر کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہیں۔'' یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال اپنے مشہور لیکچرز کا آغاز ہی یوں کرتے ہیں کہ ''قرآن پاک کا رجحان زیادہ تر اس طرف ہے کہ 'فکر' کی بجائے 'عمل' پر زور دیا جائے۔'' حقیقت یہ ہے کہ بغیر عمل کے حق پر مبنی نظریہ بھی محض ایک تصور بن کر رہ جاتا ہے اور تصور کو اپنے اظہار کے لئے اشخاص کی ضرورت ہوتی ہے اگر سچے نظریہ کو تھامنے کے لئے افراد میسر نہ ہوں تو وہ صرف کتابوں تک محدود ہو کر ماضی کی یادگار بن جاتا ہے۔

عظیم مفکر و راہنما محترم پرویز صاحب بار بار کنونشن میں تربیت کے دوران یہ کہا کرتے تھے کہ ''قرآنی نظام کی داعی جماعت کے افراد کو دیکھنا چاہیے کہ انہوں نے اپنے اندر کس قدر تبدیلی پیدا کی ہے۔ ان کا قلب و دماغ کس حد تک قرآنی تصورات سے ہم آہنگ ہو چکا ہے۔ ان کی سیرت و کردار کہاں تک قرآنی قالب میں ڈھل چکے ہیں۔ ان کی آرزوؤں اور ارادوں کے محرکات کس حد تک قرآنی مقاصد ہیں۔ وہ اپنی ذات' اپنے اعزہ و اقارب اور دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملات میں قوانین خداوندی کی کس قدر نگہداشت کرتے ہیں۔ اگر ہمارے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تو پھر آپ نے دوسرے معیاروں کے مطابق کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لی ہو' قرآن کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں۔ لیکن اگر ہمارے کردار اور تصورات میں انقلاب پیدا ہو چکا ہے تو یہ کامیابی بڑی کامیابی ہے۔''

وہ بار بار سمجھاتے تھے کہ ''قرآن کریم کا حقیقی مقصد انسان کی سیرت و کردار میں خوشگوار تبدیلی پیدا کرنا ہے کہ اتباع کتاب کا پہلا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ خود تمہاری اصلاح ہو۔ لیکن تم دوسروں کی اصلاح کے پیچھے تو لٹھ لئے پھرتے ہو' لیکن اپنی اصلاح کی فکر نہیں کرتے۔'' اور یہ کہ

''آپ نہ تو اپنی دعوت کے نتائج کی سست روی سے گھبرایئے اور نہ ہی سامریان عصر حاضر کی کامیابی کو ان کے مسلک کی صداقت کی علامت سمجھئے اور اسے اچھی طرح سے سمجھ لیجئے کہ اس میں سب سے زیادہ گراں بہا متاع سفر اور محکم ترین سامان حفاظت' آپ کی سیرت کی بلندی اور کیریکٹر کی پختگی ہے۔ آپ کی کامیابی کا سب سے بڑا راز' آپ کی اپنی ذات کے ساتھ دیانت اور دوسروں کے ساتھ حسن معاملہ میں پوشیدہ ہے۔ اگر آپ نے اپنے اندر یہ جوہر پیدا کر لیے تو پھر آپ کو دنیا کی کوئی

طاقت شکست نہیں دے سکتی ہے۔'' ہم نے اس طرح کا سب کچھ پس پشت ڈال دیا ہے پھر اپنی تباہی کی وجہ پوچھتے ہیں۔

قرآن حکیم کی اقدار یا Values کے مطابق چلنے کی کوشش مسلسل کرنے سے اور ساتھ ساتھ اس پیغام عظیم کو عام کرنے سے ہمیں ہماری منزل مل جائے گی۔ جسے ''کردار'' یا ''کیریکٹر'' کہتے ہیں۔ اس طرح سے پیام قرآنی بہت تیزی سے پھیلے گا۔ جیسا کہ محترم پرویز صاحب کی زندگی کے ماڈل سے ثابت ہوتا ہے۔ ہمیں کچھ اسی طرح سے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق کرنا ہوگا۔ اس پرامن اور آئینی اور احسن طریقے سے جو صبر طلب اور محنت طلب بھی ہے' ہم سے قربانیاں بھی مانگتا ہے' اس سے بڑے گہرے اور دور رس اثرات نوع انسانی پر مرتب ہوتے ہیں۔ شاید سائنس میں ''کونز'' اسے Miami Effect کہتا ہے اور کووے Covey کی اصطلاح میں Whale Effect اور ڈاکٹر فرام کے الفاظ میں Integrated-Step کہتے ہیں۔ مثلاً قائداعظم کے آٹھ یا دس سال کا قلیل عرصہ اور محترم پرویز صاحب کی بے سروسامانی اور ہر طرف سے شدت کی مخالفت اور پھر تمام دنیا میں ان کے کام کے اثرات جو تیزی سے پھیلے اور مزید پھیلیں گے وغیرہ۔ یہ زندہ مثالیں ہیں۔ یہ سب صرف کردار سے ممکن ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ ''اپنے اللہ کے لئے ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ اور حالات و کوائف نے تمہیں جس منزل میں رکھا ہے وہیں سے حصول مقصد کی ابتدا کر دو۔ ((33/46۔ تو عزیز بھائیو' بہنو اور بزرگو ہو سکے تو آج سے یہ کردار سازی کا کام شروع کر دیں۔ پھر دیکھئے خدا کا قانون آپ کو کیا بنا دیتا ہے۔ ورنہ ہم کتنی بھی بزمیں دنیا میں بنا لیں۔ کسی طرح کی بھی بنا لیں' یہ سب کچھ ممفورڈ کے الفاظ میں محض Decorative-Style ہوگا اور کچھ بھی نہیں اور قرآن حکیم کے معیار کے مطابق کہ ''تم نے محض چند نام رکھ دیئے ہیں جن کی حقیقت محض ناموں کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔''

اللہ تعالیٰ آپ کو قرآنی کردار کی تخلیق کی توفیق عطا فرمائے۔ قرآنی کردار کا دوسرا مطلب ہے کہ نوع انسانی کے لئے ہم روزانہ کیا دیتے ہیں۔ سرمایہ زدہ ذہنیت کا تقاضا ہے ''لینا'' اور زیادہ سے زیادہ لینا' لیکن اس سے کردار مٹتا چلا جاتا ہے' ذات برباد ہوتی جاتی ہے اور انسان پست سے پست ترین حالت کی طرف چلتا چلا جاتا ہے۔ یعنی اسفل سافلین۔ اس کے برعکس جو دیتا ہے یا زیادہ سے زیادہ فلاح نوع انسانی کے لئے دیتا ہے' وہ فلاح پاتا ہے۔ اسی کی نشوونماءِ ذات ہوتی چلی جاتی ہے۔ یعنی آپ کے سامنے ارجنٹ ترین سوال و معاملہ یہ ہے کہ ''میں دوسروں کے لئے بہتر سے بہتر کیا کر سکتا ہوں؟ What Best I can do for Others? اور یاد رکھئے کہ جب تک اس سوال کا جواب عملی طور پر آپ کی زندگی سے نہیں ابھرتا' مسلسل و متواتر' آنے والی بقایا زندگی میں' تو کردار نام کی چیز کا خیال بھی دل سے نکال دیجئے اور قرآنی پیغام تو ایسے لوگ پھیلا ہی نہیں سکتے۔ مجھے امید ہے کہ آپ سب سنجیدگی سے بار بار ان حقائق پر غور و فکر کریں گے اور زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں گے کہ یہ زندگی دوبارہ نہیں ملے گی۔ اللہ آپ سب کو خوش و خرم رکھے اور آپ کو کامیابیاں عطا کرے۔

پاکستان زندہ باد

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کیا شوہر اپنی بیوی کو بدنی سزا دے سکتا ہے؟

(اضۡرِبُوۡهُنَّ کی تفہیم)

میرا مقالہ ''بعنوان قرآنی تعلیمات کے مطابق مرد عورت سے افضل اور نہ ہی عورت مرد سے کمتر ہے'' ستمبر سے دسمبر کے طلوعِ اسلام کے شمارے میں چار اقساط میں شائع ہوا ہے۔ اِسے بہت سراہا گیا اور اب قارئین کی خواہش کی تکمیل میں اسے کتابچہ کی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اِس مقالہ پر ادارہ سے وابستہ دو مُعزز اصحاب کی طرف سے، جن میں ہم سب کے اُستادِ گرامی بھی شامل ہیں، عورت کو مار پیٹ کے عنوان کے متعلق دو خطوط میں وضاحت مانگی گئی ہے۔ لہٰذا اُن کے مُختصر اہم نکات بیان کرتے ہوئے اپنی سمجھ کے متعلق وضاحت کی جا رہی ہے۔

ایک خط میں ہمارے اُستادِ گرامی مُحترم شیخ اللہ دِتہ ایڈووکیٹ نے بھی میرے مقالہ پر اسی نُکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''ڈاکٹر انعام الحق صاحب کے مضمون کے کچھ حصے معمولی وضاحت طلب ہیں لیکن انہیں وجہ تبصرہ نہیں بنایا جا سکتا۔ ان کا مضمون عالمی سطح پر پذیرائی حاصل کرے گا۔

جیسا کہ آپ کے پہلے بھی علم میں ہے مَیں عورت کی بدنی سزا کے خلاف ہوں اور اضۡرِبُوۡهُنَّ کا ترجمہ درست خیال نہیں کرتا۔ (اِس ضِمن میں اُن کے موقف سے اختِلاف تو کیا جا سکتا ہے، لیکن اُسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا) بدنی سزائیں مرد و عورت کے لئے دوسرے جرائم میں ہیں جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے بھی مردوں کی سزا بدنی (16:4) کا حوالہ دیا ہے کہ۔

> قانون میں امتیاز رکھنے کی روش ایک مہذب معاشرہ میں روا رکھنا تو کُجا یہ تو سوچ میں بھی نہیں لائی جاتی۔ لہٰذا اگر بیوی کی نام نہاد اصلاح کے لئے چھینٹی شوہر لگا سکتا ہے تو یہی اختیار شوہر کی اصلاح کے لئے بیوی کو بِلا امتیاز خود بخود منتقل ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں لگتا ہے کہ ہمارے معاشرہ میں شوہروں کو پٹنے کے علاوہ دیگر فرائض ادا کرنے کی فُرصت ہی نہیں مِلا کرے گی

وَالَّذٰنِ یَاۡتِیٰنِہَا مِنۡکُمۡ فَاٰذُوۡہُمَا ۚ فَاِنۡ تَابَا وَاَصۡلَحَا فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡہُمَا ؕ (16:4)

اور اگر دو مرد اِس قسم کی بے حیائی کے مُرتکب ہوں تو انہیں مناسب بدنی سزا دو۔ لیکن اگر وہ اپنے کئے پر نادم ہو کر اِس

سے باز آجائیں اور اپنی اصلاح کر لیں، تو اُن سے درگذر کرو۔ (جبکہ عورت کے لئے فحاشی کے ضمن میں بھی بدنی سزا مقرر کی گئی ہے۔)

اِسی طرح سوال پیدا ہوتا ہے کہ نُشُوزَھُن میں بدنی سزا صرف عورت کے لئے کیوں؟ مرد کے ''نشوز یا اعراض'' (4:128) میں مرد کو بدنی سزا تجویز نہیں ہوئی۔ وہاں صرف صلح کے لئے کہا گیا ہے یا عدم صلح میں ''جدائی'' تجویز ہے۔''

اسی تناظر میں چوہدری محمد لطیف صاحب سے بھی خط و کتابت ہوئی جن کے متعلقہ نکات درج کئے جا رہے ہیں۔

''پہلی بات یہ کہ میری نظر میں سورۃ النساء کی آیت چونتیس کا تعلق مرد عورت سے نہیں بلکہ میاں بیوی سے ہے اور دوسری یہ کہ ہنستے بستے گھر کو اجڑنے اور بچوں کو تباہی سے بچانے کے لیے جہاں تمام حربے ناکام ہو جائیں وہاں مارنے کی بغرض اصلاح اجازت دی گئی ہے۔ اسے فرض قرار نہیں دیا گیا۔

کسی دوسرے فرد کو مارنا بظاہر ناروا ہے۔ لیکن مارنے کی بھی کئی اقسام ہیں۔ مارا ایذا رسانی کے لئے بھی جاتا ہے اور اصلاح کے لئے بھی۔ ضرورت پڑے تو استاد اپنے شاگردوں کو اور مائیں اپنے بچوں کو بغرض اصلاح چھینٹی لگاتی ہیں۔ اسی طرح جب دھلائی کے سارے طریقے ناکام ہو جاتے ہیں تو داغ دھبے دور کرنے کے لئے دھوبی کپڑوں کو چھینٹی لگاتا ہے۔ مارنا اسے بھی کہتے ہیں لیکن اس پر نہ مار کھانے والے کی تذلیل ہوتی ہے نہ کسی دوسرے کو اعتراض ہوتا ہے۔

گھر میں بیوی اگر سرکشی اختیار کرتی ہے (جس کے امکانات کا خالقِ کائنات کو علم تھا) تو اصلاح احوال کے لئے پہلے پند و نصائح، پھر ہمبستری سے اجتناب اور آخر میں ضروری سمجھا گیا کہ اگر تھوڑی بہت چھینٹی لگانے سے گھر بچ سکتا ہو تو اسے بھی آزما لیا جائے کیونکہ اس کے بعد ہمیشہ کی جدائی اور عمر بھر کے پچھتاوے کے سوا کوئی چارا باقی نہیں رہتا۔ طلاق کی راہ میں جہاں اللہ تعالیٰ نے بہت سی پابندیاں لگائی ہیں وہاں اس سے بچنے کے لئے ممکنہ علاج بھی تجویز فرمائے ہیں جن میں بغرض اصلاح (نہ کہ بطور سزا) تھوڑی بہت چھینٹی لگانا آخری علاج ہے۔ عربی مَیں جانتا نہیں اور اردو یا انگریزی میں چھینٹی سے بہتر لفظ میرے علم میں ہے نہیں۔ یہی لفظ ماؤں سے سنتے آئے ہیں باز آ جاؤ ورنہ ایسی چھینٹی لگاؤں گی کہ تمہیں نانی یاد آ جائیگی۔

میرے محترم استاد ڈاکٹر انعام الحق صاحب مارنے کو ناجائز نہیں سمجھتے مگر یہ حق وہ خاوند کی بجائے حاکمِ وقت یا عدالت کو دیتے ہیں۔ لگتا ہے گھر کو تباہی سے بچانے کے لیے خاوند اصلاحِ احوال کے لیے بیوی کو ایک آدھ چپت رسید کر دے تو یہ ان کے نزدیک بیوی کی تذلیل ہے لیکن حکومت کا جلاد تارا مسیح اس کے ننگے بدن پر کوڑے برسائے تو اس سے نہ خاوند بیوی کے مابین محبت و مودت مجروح ہوگی نہ ہی طلاق کی نوبت آئیگی۔''

اِس خط کا میری طرف سے جواب دیا گیا کہ:

میرے پیارے بھائی جانتے ہیں کہ قانون میں امتیاز رکھنے کی روش ایک مہذب معاشرہ میں روا رکھنا تو کُجا یہ تو سوچ میں بھی نہیں لائی جاتی۔ لہٰذا اگر بیوی کی نام نہاد اصلاح کے لئے چھینٹی شوہر لگا سکتا ہے تو یہی اختیار شوہر کی اصلاح کے لئے

بیوی کو بِلا امتیاز خود بخود منتقل ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں لگتا ہے کہ ہمارے معاشرہ میں شوہروں کو پٹنے کے علاوہ دیگر فرائض ادا کرنے کی فُرصت ہی نہیں مِلا کرے گی۔ اسلامی حکومت کی اطاعت دونوں مردوزن پر ماتھے پر بغیر شکن لائے اور بِلا تردد دِل کی کامل رضامندی سے کرنا مومنین کا بنیادی فریضہ ہے، اسے ننگے بدن بیوی کی زناکاری کی مترادف پٹائی کی سزا اور وہ بھی تارامسیح کے ہاتھوں سے تشبیہ دینا جائز نہ ہوگا۔

ایسی سزا کا تصور قرآنی ذہن میں تو چوہدری صاحب پیدا ہی نہیں ہونے دینا چاہیے۔ میرے خیال میں نکاح کے معنی ہی معاہدہ ہوتا ہے جس میں دو پارٹنرز بمعنی زوج بغیر کسی اکراہ کے اور دِل کی پوری رضامندی سے داخل ہوتے ہیں تاکہ اپنے نئے گھر کو جنت کا نمونہ بناسکیں۔"

اس خط کے جواب میں چوہدری صاحب نے اُستادِ گرامی کے نُکتہ کی وضاحت کی کہ:

"آپ نے فرمایا منطق کی رو سے کسی کجروی کی جو سزا بیوی کے لئے ہے وہی سزا خاوند کے لئے بھی ہوگی۔ آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہونگے میں تو منطق نہیں جانتا مگر قرآنِ کریم میں ہم دیکھتے ہیں کہ سورہ النساء کی آیت 34 میں عورت کے لئے نشوز کی سزا مختلف ہے اور آیت 128 میں خاوند کے اسی جرم کی سزا کچھ اور ہے۔"

قبل اس کے کہ ہم ایک ہی عمل کی سزا میں مرد کے لئے نرم اور عورت کیلئے سخت سزا کا جائزہ لیں، محترم اللہ دِتہ صاحب ایڈوکیٹ نے نشوز کے معانی بھی اپنے خط میں یوں درج کئے ہیں کہ

1۔ میاں بیوی میں سے ایک کا مخالفت پر اتر آنا۔

2۔ نافرمانی کرنے لگنا۔

3۔ جھگڑنا۔

4۔ بدسلوکی کرنا۔

5۔ ایک دوسرے کے خلاف یا سامنے کھڑے ہو جانا۔

6۔ متنفر ہو جانا اور

7۔ بلند ہونے اور بڑا ہونے کا اظہار کرنا۔

اِن سبھی معانی کی رو سے انسان کا اپنے فرائضِ منصبی کے خلاف ہونے کے معنی کی دلالت ہوتی ہے۔ اِسی لئے راغب نے کسی چیز کا اپنی جگہ (فرائضِ منصبی) سے ہٹ جانا بتائے ہیں۔

یہاں پہلے پانچ معانی میں یہ اضافی اور مخصوص معانی میں زیرِ بحث شوہر اور بیوی کے تعلقات کے موضوع میں استعمال ہوتا ہے۔

اِس کے برعکس منطقی طور پر دیکھا جائے تو نشوز کے اِن درج بالا سات معانی میں چھٹا اور ساتواں معانی مخصوص اور اضافی پوزیشن میں صِرف شوہر اور بیوی کے تعلقات پر شامل نہیں، بلکہ یہ مُطلق اور سبھی مردوزن پر وارد ہونے کا تاثر دیتے

ہیں اور اِن سے کسی شوہر اور بیوی وغیرہ کے ساتھ تقابل نہیں کیا جانا چاہیے۔

اب ہم سوال کے اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں، جس کی نشاندہی اُستادِ گرامی شیخ اللہ دتہ صاحب اور چوہدری صاحب دونوں نے کی ہے کہ سورہ النساء کی آیت 34 میں عورت کے لئے نشوز کی سزا مختلف ہے اور آیت 128 میں خاوند کے اسی جرم کی سزا کچھ اور ہے۔

اِس کی نشاندہی کرتے ہوئے چودہری صاحب ہمارے اِس موقف کو جُھٹلا رہے ہیں کہ قانون اور خصوصی طور پر قرآنی قوانین بِلا امتیاز ہوتے ہیں جس میں میاں بیوی کے ایک ہی قِسم کے نشوز کے وقوع پذیر ہونے پر غیر امتیازی سزائیں نہیں ملتی ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ زیادہ گہرائی میں جاتے تو وہ جان لیتے کہ آیت 34 میں نشوز میاں بیوی کا نجی معاملہ نہیں بلکہ مُطلق طور پر سبھی عورتوں پر اطلاقی پوزیشن رکھتا ہے اور اللہ کے مقرر کردہ فرائضِ منصبی سے نشوز کی صورت میں سزا کا حقدار ہے۔

اِس کے برعکس دوسری درج آیت کا تعلق اضافی اور مخصوص طور پر میاں بیوی کا نجی معاملہ ہے، لہذا اجتماعی نہ ہونے کی وجہ سے سزا کا حقدار نہیں گردانا جاسکتا، بلکہ ایسی صورت میں معاشرہ سے کہا گیا ہے کہ وہ اُن کے درمیان صُلح کرانے کی ہر ممکن کاوشیں کریں اور ناکام ہونے کی صورت میں علیحدگی کا اعلان کر دیں۔ لہٰذا یہاں مناسب ہوگا کہ بیان کی گئی دونوں آیات کا تجزیہ کر کے بات کی مزید وضاحت کی جائے۔

پہلی آیت سورہ النساء کی 34، جس کا حوالہ دیا گیا ہے، اُس کی تفصیل میں ہے کہ

34۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ ط فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ ط وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ

مرد اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے، عورتوں کو سامان رزق مہیّا کرنے کے ذمّہ دار ہیں۔ خدا نے مرد اور عورت کو بعض امور میں ایک دوسرے پر فضیلت عطا فرمائی ہے، (مردوں کی فضیلت یہ ہے کہ عورت جسمانی بناوٹ اور مختلف جسمانی فریضوں کے اعتبار سے مسلسل کام نہیں کرسکتی، اس لئے مردوں کی ذمّہ داری ہے کہ وہ اکتساب رزق کریں)، اور یوں مردوں کے اکتساب رزق سے عورتوں کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔

پس اس طرح ان (عورتوں) کی صلاحیّتیں نشو ونما پاتی ہیں، اور وہ اپنی صلاحیّتوں کو اسی مقصد کے حصول میں صرف کریں گی، جس کے لئے وہ مخصوص صلاحیّتیں دی گئی ہیں۔ (اس طرح جب عورتوں کو سامان رزق کے اکتساب سے فرصت مل گئی) تو وہ اس چیز کی حفاظت کرسکیں گی (جنین کی) جو پوشیدہ طور پر ان کے سپرد کی گئی ہے، اور اگر (بیوی نہیں) عورتوں کی طرف سے تقسیم کار سے سرکشی کا اندیشہ لاحق ہوجائے، تو (1) معاشرہ انہیں سمجھائے، (2) باز نہ آئیں تو ان کے شوہروں یا سرپرستوں سے معاشرہ کہے کہ ان کو خواب گاہوں میں محصور کردو، اس کے باوجود سرکشی نہ چھوڑیں تو (3) معاشرے کی عدالت انہیں بدنی سزا دے۔

وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَہُنَّ فَعِظُوۡہُنَّ کا مفہوم:

یہاں میاں بیوی کی بات نہیں ہو رہی ہے۔ بات الرجال اور النسآء (4:34) کی ہو رہی ہے اور معاشرے سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تمہیں کسی ایک عورت کی طرف سے یا عورتوں کی طرف سے اندیشہ ہو کہ وہ اپنے فرائض منصبی کے ساتھ بچوں کی نگہداشت نہیں کر رہی ہیں، جس کی وجہ سے یا ان کے منفی رویے کی وجہ سے گھر یا معاشرہ کا ماحول صحت مند نہیں رہا تو فَعِظُوۡہُنَّ (4:34) قرآنی معاشرے کی حکومت انہیں سمجھائے گی، نصیحت کرے گی کہ باز آ جاؤ۔ یہ خاوند کو نہیں معاشرے کو یعنی حکومت کو حکم دیا جا رہا ہے۔

وَاہۡجُرُوۡہُنَّ فِی الۡمَضَاجِعِ (4:34) کا مفہوم:

اگر کچھ عورتیں یا (کوئی عورت) باز نہیں آ رہی ہیں حکومت خاوندوں سے کہے کہ وہ انہیں اپنی خوابگاہوں سے الگ کر دیں اور ان سے عارضی طور پر جنسی تعلق ختم کر لیں۔ یہ کچھ محبوس کر دینے والی بات ہے، جس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے کہ اگر تمہیں خطرہ ہو کہ کوئی بے حیائی کی بات ہو جائے گی، تو انہیں ان کے گھروں میں روک لو۔

وَاضۡرِبُوۡہُنَّ کا مفہوم:

اگر عورت خوابگاہ الگ کرنے سے بھی اپنی ان حرکتوں سے باز نہ آئے تو پھر عدالت یا حکومت عورت کو بدنی سزا دے گی، تاکہ یہ پھر سے فرائض کی ادائیگی اور گھروں کے ماحول کو خوشگوار بنانے پر راضی ہو جائیں۔ آگے ہے فَاِنۡ اَطَعۡنَکُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَیۡہِنَّ سَبِیۡلًا (4:34) ''جب وہ قانون کی اطاعت کرنے پر رضامند ہو جائیں، تو ان پر خواہ مخواہ ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ یہاں خاوند کا تو کہیں ذکر ہی نہیں آ رہا ہے۔ اس سے آگے ہے اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیۡرًا (4:34) ''یاد رکھو! خدا کے قوانین غالب ہیں، بالا دست ہیں''، کوئی سرکش یہ نہ سمجھ لے کہ انہیں کوئی قابو نہیں کر سکتا۔

یہاں میاں بیوی کی بات نہیں ہو رہی ہے۔ بات الرجال اور النسآء (4:34) کی ہو رہی ہے اور معاشرے سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تمہیں کسی ایک عورت کی طرف سے یا عورتوں کی طرف سے اندیشہ ہو کہ وہ اپنے فرائض منصبی کے ساتھ بچوں کی نگہداشت نہیں کر رہی ہیں، جس کی وجہ سے یا ان کے منفی رویے کی وجہ سے گھر یا معاشرہ کا ماحول صحت مند نہیں رہا تو فَعِظُوۡہُنَّ (4:34) قرآنی معاشرے کی حکومت انہیں سمجھائے گی، نصیحت کرے گی کہ باز آ جاؤ۔ یہ خاوند کو نہیں معاشرے کو یعنی حکومت کو حکم دیا جا رہا ہے

ہماری بصیرت کے مطابق، اس آیت کے مفہوم کے اعتبار سے یہ شکل ہے۔ معانی کے لئے جس کا جی چاہے لغتِ ''لسانِ عربی'' کی کتاب اٹھا کر دیکھ لے۔ ہم نے لغت ''لسان عربی'' اور قرآن کے انداز تصریف آیات کو ترجیح دی ہے اور ساتھ ہی اس کا بھی خیال رکھا ہے کہ جو مفہوم لیا جائے، وہ قرآن کی مجموعی تعلیم اور دیگر آیات کے مطابق ہو۔ قرآن تو اپنے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت ہی یہ دیتا ہے کہ اس کی تعلیم میں کوئی تضاد نہیں

ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ قرآن ایک مقام پہ تو ایک مساوات کی ذہنیت پیدا کرے، اور دوسرے مقام پہ اس کے خلاف کچھ کہے، قرآن ایسا کبھی نہیں کرے گا۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ میاں بیوی کا رشتہ باہمی پسندیدگی کا ہے۔ اگر دونوں طرف سے کسی ایک میں بھی کسی قسم کی کراہت آ گئی تو فریق مقابل دوسرے کے لیے حرام ہو جائے گا (4:19)۔ ازدواج کا باہمی رشتہ رفاقت کا ہے، مؤدت وسکینت اور رحمت کا ہے، اس لئے قرآن کہتا ہے کہ دونوں کے حقوق مساوی ہیں تو وہ شوہر کو مار پیٹ کا اختیار کیسے دے سکتا ہے؟ اس آیت میں میاں بیوی کا تو ذکر ہی نہیں ہے، ذکر ہے تو الرجال اور النسآء کا ہے۔ میاں بیوی کا ذکر اگلی سورہ النساء کی ایک آیت میں آ رہا ہے، جس کا حوالہ چوہدری صاحب نے اپنے خط میں دے کر امتیازی سزا کی نشاندہی کی ہے۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ میاں بیوی کا رشتہ باہمی پسندیدگی کا ہے۔ اگر دونوں طرف سے کسی ایک میں بھی کسی قسم کی کراہت آ گئی تو فریق مقابل دوسرے کے لیے حرام ہو جائے گا (4:19)۔ ازدواج کا باہمی رشتہ رفاقت کا ہے، مؤدت وسکینت اور رحمت کا ہے، اس لئے قرآن کہتا ہے کہ دونوں کے حقوق مساوی ہیں تو وہ شوہر کو مار پیٹ کا اختیار کیسے دے سکتا ہے؟

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا (4:128)

اور اگر کوئی عورت اپنے خاوند کی طرف سے سرکشی یا بے رغبتی محسوس کرے، تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ جن شرائط پر چاہیں، آپس میں مصالحت کر لیں۔ مصالحت بہرحال بہتر ہے۔

مرد کی طرف سے سرکشی کا اندیشہ ہو تو اس کا حل:

آیت (4:34) میں کہا تھا کہ اگر تمہیں عورتوں کی طرف سے سرکشی کا اندیشہ ہو، تو اس کو آیت (4:35) کے مطابق حل کر لیا کرو۔ زیرِ غور آیت میں ہے کہ:

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا (4:128)

''اگر خاوند کی طرف سے سرکشی کا، بے رغبتی کا اندیشہ ہو'' تو اس کو بھی آیت (4:35) میں دی گئی ہدایات کے مطابق حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

میاں بیوی کے درمیان مصالحتی کوششوں کی اہمیت:

اُوپر کی آیت 128 میں تو شوہر کے نشوز کی بات ہو رہی تھی، لیکن درجِ ذیل آیت (4:35) میں نشوز کی جگہ شقاق لا کر دونوں میاں بیوی کے ساتھ ایک جیسا سلوک روا رکھنے کی ہدایت دے کر معاملہ کو واضح کر دیا ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا (4:35)

معاشرے سے کہا جا رہا ہے کہ وَاِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَيۡنِهِمَا (4:35) ’’جب بھی تمہیں احساس ہو کہ میاں بیوی میں اختلافات پیدا ہو رہے ہیں‘‘ تو فَابۡعَثُوۡا حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا (4:35) ’’تم ثالثی کرنے کے لیے ایک نمائندہ، بیوی کے خاندان سے، اور ایک نمائندہ خاوند کے خاندان سے مقرر کرو۔ اگر حکومتی ڈھانچہ نہیں ہے، تو ثالثی مقرر کرنے والا معاشرے کا سردار ہوسکتا ہے، اور اگر حکومت موجود ہے تو عدالت ثالث مقرر کرسکتی ہے، تاکہ یہ غیر جذباتی ماحول میں مصالحت کی کوئی راہ نکالیں حَکَم مصالحتی یا ثالثی نمائندے کو کہتے ہیں۔

آگے آیت ہے کہ

اِنۡ يُّرِيۡدَاۤ اِصۡلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيۡنَهُمَا (4:35)

’’اگر وہ (میاں بیوی) اور ثالث مصالحت کے ارادے سے کوشش کریں گے، تو خدا ایسی توفیق دے دے گا کہ کسی طرح تباہ ہو جائے‘‘ یعنی خدا چاہتا ہے کہ مصالحت کی صورت پیدا ہو جائے۔ مخالفت میں میاں بیوی کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں، ان کو ٹھنڈا کرنے کے لئے خدا نے مصالحت کرانے کا طریقہ بتایا ہے۔ اگر تین ماہ کی مصالحتی کوششیں بے کار چلی جائیں، تو پھر عدالت طلاق کی توثیق کر دیتی ہے کہ یہ اب میاں بیوی نہیں رہے۔

ازدواجی زندگی کا ترجمہ ہی ’’رفاقت کی زندگی‘‘ ہے۔ اگر میاں بیوی میں رفاقت و مؤدت کے تعلقات پیدا نہ ہوں، تو اس سے بڑا عذاب اور کیا ہوسکتا ہے۔

درجِ بالا قرآنی آیات کی روشنی میں ہمیں نظر آ رہا ہے کہ:

1۔ جہاں الرجل اور النساء کا ذکر میاں بیوی کے طور پر نشوز کا آپس میں معاملہ ہے تو وہاں دونوں کے درمیان سورہ النساء کی قرآنی آیات نمبر 128 اور 35 کی روشنی میں صُلح کے اقدام لینے اور ناکامی کی صورت میں طلاق کا اعلان کرنے پر ختم ہو جاتا ہے۔

2۔ جہاں الرجل اور النساء کا ذکر بغیر کسی رشتہ کے بطور مُطلق مرد و زن ہو رہا ہے، تو وہاں اپنے فرائضِ منصبی سے نشوز کے وقوع پذیر ہونے کی صورت میں دونوں مرد و زن کے لئے سورہ النساء کی قرآنی آیات نمبر 16 اور 34 کی روشنی میں بدنی سزا کا قانون نافذ کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔

لہٰذا یہ کہنا بجا ہوگا کہ نشوز کے وقوع پذیر ہونے پر مرد و عورت کو اُن کی حیثیت کے مطابق غیر امتیازی طور پر یکساں سلوک کی قرآن میں تجویز کی گئی ہے، لہٰذا اِس مسئلہ میں دونوں مرد و زن کی حیثیت یکساں ہے۔

❁❁❁❁❁

شیخ عقیل حیدر ایڈووکیٹ، فیصل آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چوتھائی صدی کا قصہ ہے

طلوعِ اسلام سے میرا پہلا تعارف محترم محمد صدیق رہبر صاحب (مرحوم) کے ذریعے ہوا۔ وہ میرے عزیز دوست لالہ اسلم کے والد تھے۔ شاید اگر میرے اندر خود سچائی کی جستجو، مطالعے کا ذوق اور قرآنِ کریم کو سمجھنے کی بے تاب خواہش موجود نہ ہوتی تو یہ تعارف کبھی نہ ہو پاتا۔ مگر قدرت نے مجھ میں حق کی تلاش کی ایک ایسی آگ روشن کر رکھی تھی جس نے مجھے بالآخر طلوعِ اسلام تک پہنچا دیا۔

میرے مزاج میں ایک فطری بے چینی ہمیشہ سے موجود تھی۔ اپنے اردگرد کے ماحول کو دیکھتے ہوئے ''جو ہے، جیسا ہے'' پر اطمینان کبھی نصیب نہ ہوا۔ لڑکپن سے جوانی کی دہلیز تک پہنچتے پہنچتے موجودہ معاشرتی اور فکری نظام کی فرسودگی کا احساس میرے اندر شدت اختیار کرتا گیا۔ مگر اس کے ساتھ ایک سوال بھی مسلسل میرے وجود میں پرورش پاتا رہا: اگر یہ درست نہیں تو پھر درست کیا ہے؟

میرے اندر برپا اس فکری طوفان کو اگر کسی چیز نے سمت عطا کی تو وہ قرآنِ کریم تھا۔ قرآن کو قرآن سے سمجھنے کا پہلا باقاعدہ تعارف مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویز کی کتاب "مطالب الفرقان" (جلد اول) سے ہوا۔ اس کتاب نے گویا میرے باطن کی دنیا بدل کر رکھ دی۔ اس کے بعد جیسے جیسے علامہ پرویزؒ کے خطابات سنتا اور قرآنِ مجید کے مختلف موضوعات پر ان کی تصانیف کا مطالعہ کرتا گیا، ویسے ویسے قرآن کی آیات میرے دل و دماغ پر نئے معانی کے ساتھ منکشف ہوتی چلی گئیں۔ فرسودہ نظام کا تقدس جب میری نظر میں پارہ پارہ ہو گیا تھا تو اب اگر میں چاہتا تو حقیقت کی ایک جھلک پا کر دوسروں کی طرح ''انا الحق'' کا نعرہ لگاتا، دنیا و دین کی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو کر اپنی داخلی کیفیت ہی کو منزل سمجھ لیتا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ ''لا إلہ'' کا مقام جتنا ضروری ہے، الا اللہ کے بغیر اتنا ہی خطرناک بھی ہے۔

نفی کے مرحلے سے گزرنے والے بہت سے لوگ اثبات تک نہیں پہنچ پاتے۔ ان کا ''لا إلہ'' ہی انہیں ساری زندگی نفی کی کیفیت میں گرفتار رکھتا ہے۔ جب انسان پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اس کے تراشے ہوئے بت جھوٹے تھے تو اس کے اندر ایک شدید بغاوت جنم لیتی ہے۔ وہ ہر باطل کو توڑ ڈالنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، مگر بہت کم لوگ حضرت ابراہیمؑ کی طرح بت شکنی کے بعد کائنات کے اس حقیقی خدا کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں جو صرف نفی نہیں بلکہ اثبات ہے۔

میں نے بھی قرآن کے دکھائے ہوئے اسی راستے پر چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔

آج بزمِ طلوعِ اسلام فیصل آباد کی نمائندگی اور صدارت کی ذمہ داری سنبھالتے ہوئے تقریباً ایک چوتھائی صدی گزرنے کو آئی ہے۔ جب کبھی پیچھے مڑ کر خود احتسابی کی نگاہ سے دیکھتا ہوں تو بے شمار واقعات ذہن کے دریچوں میں دستک

دینے لگتے ہیں۔ کہیں اپنی کوتاہیاں دکھائی دیتی ہیں، کہیں اللہ کی عطا کردہ توفیقات۔

ایک حقیقت البتہ پوری شدت سے محسوس ہوئی کہ نمائندگی کا یہ تاج دراصل پھولوں کی سیج نہیں بلکہ ذمہ داریوں کا بوجھ ہے اور میں نے بے فکری کی بجائے یہ ذمہ داری قبول کی تھی کیونکہ جب بھی میں نے خدا کے پروگرام کو سمجھنے کے لیے کائنات پر نگاہ ڈالی تو ہر شے، طوعاً و کرہاً اپنے حصے کی ذمہ داری پوری کرتی دکھائی دی اس لیے یہ بات واضح طور پر سمجھ آتی ہے کہ اگر خدائی پروگرام کا حصہ بننا ہے تو ذمہ داری تو اٹھانی پڑے گی

لیکن مجھے پیدا کیا اس قوم میں تو نے　　جس قوم کے بندے ہیں غلامی پہ رضا مند

مگر افسوس کے ساتھ ایک سوال آج بھی میرے دل میں زندہ ہے کہ آخر ہمارے ہاں ذمہ داری سے گریز کیوں ہے؟

یہی بات میں نے اس طویل سفر میں شدت سے محسوس کی کہ قرآنی فکر کو سمجھنے والوں میں سے بہت سے افراد ذمہ داری قبول کرنے سے گریزاں نظر آتے ہیں۔ ہر شخص یہ دعویٰ ضرور کرتا ہے کہ اسے روشنی قرآن سے ملی، مگر روشنی پانے کے بعد اس روشنی کو دوسروں تک پہنچانے اور قرآنی نظام کے قیام کے لیے اپنا حصہ ڈالنے پر آمادہ بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔

اگر آپ قرآن کو ایک نظام سمجھتے ہیں تو یہ بات اچھی طرح جان لیں کہ کوئی بھی نظام صرف تنقید سے قائم نہیں ہوتا۔ نظام قائم کرنے کے لیے ایک منظم جدوجہد، نظم وضبط، باہمی تعاون اور ذمہ داری قبول کرنا پڑتی ہے۔ لیکن قرآنی افکار کے حامل لوگ ذمہ داری سے زیادہ تنقید کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ تنقید۔۔۔ پھر تنقید۔۔۔ اور صرف تنقید

اس زندگی اور اس کی لگژری سے اتنا پیار ہے کہ نہ کوئی عملی میدان میں اترنا چاہتا ہے، نہ کسی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانا چاہتا ہے، نہ کوئی تعمیری کردار ادا کرنے پر آمادہ دکھائی دیتا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہی لوگ سب سے زیادہ ادارۂ طلوعِ اسلام کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں؛ اسی ادارے کو جس سے انہوں نے فکر کی پہلی کرن حاصل کی تھی۔ اختلاف کا حق ہر شخص کو حاصل ہے، مگر اختلاف اگر عمل سے خالی ہو جائے تو وہ اصلاح کے بجائے صرف دل آزاری بن کر رہ جاتا ہے۔

ایسے موقع پر میرا ذہن بار بار سورۂ الصّف کی ابتدائی آیات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ان آیات کا پیغام نہایت واضح ہے کہ پوری کائنات اللہ کے پروگرام کی تکمیل میں مسلسل مصروفِ عمل ہے۔ پھر اہلِ ایمان سے سوال کیا جاتا ہے کہ تم وہ بات کیوں کہتے ہو جس پر خود عمل نہیں کرتے؟ اللہ کے نزدیک یہ بات انتہائی ناپسندیدہ ہے کہ انسان دعویٰ تو بڑے کرے مگر اس کی عملی زندگی اس کی تائید نہ کرے۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ② كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ③

میرا ایمان ہے کہ قرآن صرف نظریات کی کتاب نہیں، بلکہ عمل، ذمہ داری اور اجتماعی جدوجہد کی کتاب ہے۔ اگر ہم نے قرآن سے واقعی روشنی پائی ہے تو اس روشنی کو اپنے کردار، اپنے عمل اور اپنی اجتماعی ذمہ داری کے ذریعے معاشرے تک پہنچانا بھی ہمارا فرض ہے تو آیئے قرآنی نظام قائم کرنے کے لیے اس نظام کا حصہ بنیے کیونکہ اس آسمان کے نیچے اگر کوئی ادارہ قرآن کریم کو بطور نظام نافذ کرنے کے لیے کوشاں ہے تو وہ طلوعِ اسلام ہے۔

یکے از مطبوعات کاروانِ باغبان

❁ مملکتِ خداداد پاکستان بفیضان جناب محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم 1947ء میں مل گئی۔ قرآنِ مجید کی 47ویں سورۃ کا نام ''محمدؐ'' ہے اور 14 اگست کی منفرد اہمیت یہ ہے کہ سورۃ ابراہیمؑ کا نمبر 14 واں ہے۔

معمارِ حرم، باز بہ تعمیرِ جہاں خیز
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

❁ پاکستان بننے کے بعد سامریوں کے ہتھے چڑھ گیا سرمایہ داری‘ جاگیرداری‘ مذہبی پیشوائیت اور فیملی لمیٹڈ نے انوکھے تجربات کئے ان تجربات کی باری میں قرآنی پاکستان کی باری بھی آجانی چاہیے تھی لیکن نہ آئی۔

ہے کہاں روز مکافات اے خدائے دیر گیر؟

❁ اللہ جل جلالہٗ اور ربِ العالمین کے عالمی نظامِ ربوبیت پر ربانی فنڈ بھی قائم نہ ہوسکا۔

مُردہ آں ایماں کہ ناید درعمل

پاسدارانِ مملکتِ خداداد پاکستان کے مَردِ غیور اور صادق وآمین تہذیب کے جانباز! اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام قائم کرنے کے لئے نکل کر تو دیکھیں غریب کچلے ہوئے عوام استقبال کے لئے تیار کھڑے ہیں۔

ہم سب کا پاکستان۔۔۔مذہب نہیں نظام!

والسلام

قارئین طلوعِ اسلام توجہ فرمائیں

ماہنامہ طلوعِ اسلام کی درجِ ذیل سالانہ خوبصورت جلدیں 1200 روپے فی جلد کے حساب سے دستیاب ہیں۔ اپنے کتب خانوں میں ''طلوعِ اسلام'' کے فائلز مکمل کرنے کے لئے آرڈر فرمایئے۔ شکریہ

1985,1986,1987,1988,1991,1999,2000,2001,2002,2003,
2004,2005,2006,2011,2015,2016,2017,2018,2019
,2020,2021,2022,2023,2024,2025

پمفلٹس --- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 20 روپے علاوہ ڈاک خرچ

اسلام آگے کیوں نہ چلا	قرآن مجید کے خلاف گہری سازش	دو قومی نظریہ
اسلام کیا ہے؟	قربانی	عورت قرآن کے آئینے میں
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	قیامت موجود	پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں''
اسلام اور مذہبی رواداری	قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر	تحقیق ربوٰ (مسئلہ سود)
اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)	ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
اسلامی آئیڈیالوجی	ہندو کیا ہے؟	بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش (20 روپے علاوہ ڈاک خرچ)	ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ (قرآنی اصطلاحات کی تشریح)	تکذیب دین کون کرتا ہے اور مصلّی کسے کہتے ہیں
اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	ہماری تاریخ میں کیا ہے؟	روٹی کا مسئلہ
اسلامی قانون سازی کا فریضہ (بال سے باریک تلوار سے تیز)	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
انسانیت کا آخری سہارا	ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	نماز کی اہمیت
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری	مقام اقبالؒ	ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)
اقبال کا مرد مومن	مقام محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم	علماء کون ہیں؟
اندھے کی لکڑی	مرزائیت اور طلوع اسلام	فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں
آرٹ اور اسلام	ماؤزے تنگ اور قرآن	کافرگری
قرآن کا معاشی نظام	مومن کی زندگی	حرام کی کمائی
قرآن کا سیاسی نظام	جہاں مارکس ناکام رہ گیا	عالمگیر افسانے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شرحِ جاوید نامہ شائع ہوگئی!

مفکرِ قرآن غلام احمد پرویز علیہ الرحمتہ کے لیکچرز کی تحریر پر مشتمل اپنے انداز کی منفرد شرح جاوید نامہ شائع ہوگئی ہے۔ بڑے سائز کے 800 صفحات پر مشتمل اِس یکتائے روزگار شرح کی قیمت صرف بارہ سو روپے ہے۔ ''جاوید نامہ'' کیا ہے اس کے متعلق پرویز علیہ الرحمتہ کی زبانی خود ملاحظہ فرمایئے:۔

''علامہ اقبالؒ کی فارسی کی کتاب ہے ''جاوید نامہ''۔ اگر آپ نوجوانوں کو اسلام کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو میں یہ عرض کروں گا' مبالغے کی بات نہیں ہے' یہ ایک کتاب ''جاوید نامہ'' پڑھا دیجئے لیکن اس کے پڑھانے کے لیے ایسے لوگوں کی یا ایسے شخص کی ضرورت ہوگی جو علومِ حاضرہ کے اوپر پوری دسترس رکھتا ہو۔ یہ بڑی جامع کتاب ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ اقبالؒ کی فکر کا شاہکار ہے۔ تاریخ عالم پہ نگاہ' مذاہبِ عالم پہ نگاہ' سارے فلسفے کے اوپر نگاہ' الٰہیات کے اوپر نگاہ' سوشیالوجی کے اوپر نگاہ' تمدن کے اوپر نگاہ' نظام کے اوپر نگاہ' سب سے بڑی یہ چیز کہ قرآن کی گہرائیوں کے اوپر بڑی نگاہ۔ اگر کہیں یہ چیز نصاب کی اس انداز سے سامنے آئے پھر آپ دیکھئے گا کہ انہی نوجوانوں کی ذہنیت کیسے بنتی ہے اور کیا بنتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ کوئی دوسری قوم آئے گی۔ بڑا حسین انداز ہے۔ اقبال کے الفاظ ہیں وہ اس انداز سے بات شروع کرتا ہے کہ یہ نظام آیا تو ملوکیت بھی گئی اور یہ پاپائیت بھی گئی اور سرمایہ داری بھی گئی یہ سب چیزیں انہوں نے اُڑا دیں۔ میرے دل کے اندر جو بات چھپی ہوئی ہے آج میں اسے بے نقاب کہہ دینا چاہتا ہوں۔ الفاظ نہیں مل رہے یہ کہنے کے لیے کہ میں کیا کہوں کہ یہ قرآن ہے کیا' یہ کتاب تو نہیں کچھ اور ہی ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب جان کے اندر کسی کے یہ اتر جاتی ہے تو جان بدل جاتی ہے اور جب جان بدل جاتی ہے تو دنیا بدل جاتی ہے''۔

(بحوالہ دروس القرآن سورۃ المائدہ آیات 51 تا 56)

منگوانے کا پتہ

B-25 گلبرگ 2، لاہور۔54660، پاکستان
ادارہ طلوعِ اسلام فون: 042-35714546
idarati@gmail.com

''دوقومی قرآنی نظریہ پر اسلامی مملکت کا قیام'' کتاب کے مصنف ڈاکٹر انعام الحق 1940ء میں پیدا ہوئے۔انہوں نے 1960ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجویشن مکمل کر کے بنک ملازمت اختیار کرلی۔وہاں 34 سال کی سروس مکمل کرنے اور معاشی طور پر خود کفیل ہونے پر ریٹائرمنٹ لے لی۔

مصنف نے ریٹامنٹ کے بعد بھی اپنی علمی صلاحیت میں اضافہ کرنے کو جاری رکھا اور خصوصی طور پر اسلامک سٹڈی میں ایم۔اے، ایم فِل اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔اس کے علاوہ مصنف نے عربی زبان، فلاسفی اور قانون کی باقاعدہ ایم اے لیول تک تعلیم حاصل کی اور قانون سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ستر سال کی عمر میں باقاعدہ لاء کالج میں داخلہ بھی لے لیا۔یہ سب کچھ کرنے کا بنیادی مقصد ان علوم سے کلامِ الٰہی قرآنِ کریم کی مکمل فہم سے آگاہی کا حصول رہا ہے۔مغرب کے علاوہ خصوصی طور پر اسلامک فکر میں دلچسپی لینے کی وجہ سے پہلے ایم۔فل میں قرآنی معاشی فکر میں ''العفو کی اہمیت'' کے عنوان کا کامیابی سے دفاع کیا۔بعد ازاں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے ریسرچ کا موضوع ''حکمائے مغرب کے نظریہ خیر وشر کا مطالعہ قرآن کی روشنی میں'' لینے کا انتخاب کیا۔اسی موضوع کوملحوظِ نگاہ رکھتے ہوئے مصنف کی طرف سے نظریہ خیر اور نظریۂ پاکستان اور قرآن کے موضوعات پر دو تصانیف بھی شائع ہو چکی ہیں۔ان تصنیفات کے علاوہ بیس سال کے دوران متعدد فلاسفی اور اسلامک سٹڈی کے خصوصی موضوع پر مقالات بھی مختلف رسالہ جات میں شائع ہونے کا سلسلہ ابھی تک جاری رکھا ہوا ہے۔ٹی وی پر بھی مباحثوں میں حصہ لیتے رہے اور ایک دوبار مشہور دینی مفکرین محترم جاوید احمد غامدی اور مفتی منیب احمد صاحب کے ساتھ دینی فکری مباحث کے پروگرامز میں شمولیت اختیار کی۔ریٹائرمنٹ کے بعد کی اب تک کی 28 سالہ زندگی کا بیشتر حصہ مصنف اپنے گھر میں قائم لائبریری میں تعلیمی اور تبلیغی امور میں مصروف رہ کر گزار رہے ہیں۔اس ضمن میں وہ اپنے متعدد احباب کے سوالات کا تسلسل سے جواب دینے میں بھی دستیاب رہتے ہیں۔اس علمی اور تبلیغی امور میں اپنے آپ کو ہمہ وقت مصروف رہنے کی سعادت کے حصول کو وہ اللہ کا فضل قرار دیتے ہیں۔ان امور میں ہمہ تن دستیاب رہنے کی وجہ سے بعد از ریٹائرمنٹ کوئی بھی آمدنی لانے والی سروس کی پیشکش اُن کے لئے باعثِ کشش نہ بن سکی۔

اس کتاب کی قیمت 500 روپے جو کہ ادارہ طلوعِ اسلام کے دفتر میں دستیاب ہے۔

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.79
ISSUE
10

Monthly **TOLU-E-ISLAM**

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org

إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَاذِبُونَ ﴿١٠٥﴾

(سورۃ النحل، آیت نمبر:105)

جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان نہیں لاتے (اُن کے انکار کی اصل وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے ضد تعصب، مفاد پرستی کی وجہ سے صحیح راستہ اختیار نہیں کرنا چاہتے، لیکن کھلے بندوں اس کے اعتراف و اظہار کی جرأت نہیں رکھتے اس لئے) وہ جھوٹی باتیں وضع کرتے ہیں، اور اس طرح دوسروں کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ جھوٹے وہ خود ہوتے ہیں۔ (مفہوم القرآن از پرویز علیہ الرحمہ)